لافانی عشق

اور دوسرے افسانے

منیر الدین احمد

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ
۲۰۰۷ء

رخسانہ شمیم

کے نام

☆

جب سے میں
کھلی آنکھوں
اور وا کانوں کے ساتھ
اس ملک میں گھوم رہا ہوں
میرا منہ ہے کہ
بند کئے بند نہیں ہوتا

منفرڈ ہاؤزین
(جرمن شاعر)

فہرست

پیش لفظ	۹
لافانی عشق	۱۱
اعتماد شکنی	۲۱
خودغرض عورت	۳۲
مردہ مچھلیاں	۴۴
کلنک کا ٹیکہ	۵۵
غیر معمولی مماثلت	۶۳
اندریاپاشنسکی	۷۴
موروثی مرض	۸۴
سوزانے	۹۵
ضمیر کی ملامت	۱۰۶
امانت	۱۱۷
ساری گولیاں	۱۲۷
اوورکوٹ	۱۳۸
آدھا بوجھ	۱۴۹

پیش لفظ

میرے افسانوں کا پانچواں مجموعہ پیش خدمت ہے۔ یہ کہانیاں جرمن معاشرے کی دین ہیں، جو اتفاقی طور پر اردو زبان میں لکھی جا رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ قاری کو نہ صرف کہانیاں بلکہ ان کو پیش کرنے کا انداز بھی اوپرا لگے۔ میں اس کے لئے کوئی معذرت پیش نہیں کروں گا، کیونکہ جس معاشرے میں یہ کہانیاں وقوع میں آئی ہیں، وہ ہمارے ہندو پاک کے جانے پہچانے معاشرے سے بہت مختلف ہے۔ اس کی روایات دوسری ہیں اور وہاں پر حالات میں تبدیلی بے حد سرعت سے وقوع میں آ رہی ہے، جس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے میں محسوس کئے جا رہے ہیں۔ روایات کو رجعت پسندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کو توڑنے پر لوگ فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے اس معاشرے کی کہانیوں میں اس چیز کا در آنا قدرتی امر ہے۔ میری زندگی چونکہ اس ماحول میں بسر ہوئی ہے۔ اس لئے میری کہانیوں میں آپ کو یہاں کی زندگی کی عکاسی ملے گی، جس کے اثرات آپ کو اس زبان میں بھی نظر آئیں گے، جو میرے افسانوں میں آٹے میں نمک کی طرح گھل مل چکی ہے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ ادبی کہانیاں سچی ہوں۔ البتہ کوئی کہانی نہیں پائی جاتی، جس میں سچ کا عنصر موجود نہ ہو۔

کمر فیلڈ
۲۰ جولائی ۲۰۰۷ء

منیر الدین احمد

لافانی عشق

اگر اس روز کوئی واقف کار مجھے اوہلسڈ ورف کے قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھتا، تو یہی سمجھتا کہ میں کسی جنازے میں شرکت کرنے کے لئے آیا تھا۔ جب کہ اس چیز کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میری آمد ایک ٹورسٹ کی طرح تھی، جسے سیاحت کا شوق شہر کے مختلف حصوں میں لئے لئے پھرا تھا اور اب قبرستان کی باری آئی تھی۔ میرے لئے ہمبرگ کے قبرستان اوہلسڈ ورف میں داخل ہونے کا وہ پہلا موقعہ تھا۔ میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور کئی بار وہاں پر جانے کا ارادہ بھی باندھ چکا تھا۔ مگر ہمیشہ کوئی دوسرا کام نکل آتا تھا اور مجھے اپنا پروگرام بدلنا پڑتا تھا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ مجھے وہاں پر جانے کی کچھ ایسی جلدی تھی۔ قبرستان میں آخر سب کو ایک روز پہنچنا ہی ہے۔ آج نہ سہی، کل کو ہماری باری بھی آ جائے گی۔ مگر میتوں والی کالی گاڑی میں وہاں پر پہنچائے جانے سے پہلے میں خود اپنے قدموں سے چلتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ سب کچھ سچ ہے، جو اس قبرستان کے بارے میں مشہور ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اسے باغ عدن قرار دیتے ہیں۔ بہرصورت ہمبرگ کے باغوں میں کوئی اس کا مثیل نہیں ہے۔

اوہلسڈ ورف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ دنیا کے کسی بھی قبرستان سے بڑا ہے۔ اتنا بڑا کہ اس میں ایک دو چھوٹے موٹے شہر سما سکتے ہیں۔ اس میں پختہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں، جن پر موٹر کاریں چلتی ہیں۔ چونکہ فاصلے اتنے لمبے چوڑے ہیں کہ کسی دور دراز علاقے میں پائے جانے والے قطعے تک پہنچنے کے لئے پیدل چلنے والوں کو آدھا پونا دن درکار ہوتا ہے۔ اس لئے قبرستان کی اندرا ومنی بسیں چلتی ہیں۔ جن کا پھیرا کہیں دو تین گھنٹوں میں جا کر پورا ہوتا ہے۔ چونکہ بڑے گیٹ سے مختلف سمتوں میں جانے والی بسیں ہر پندرہ منٹوں کے بعد چھوٹتی ہیں، اس لئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بارہ

پندرہ بیس ہمہ وقت قبرستان کے اندر گھوم رہی ہوتی ہیں۔ البتہ قبرستان کی حرمت کے پیش نظر ان کی رفتار دھیمی رکھی جاتی ہے اور وہ اتنی خاموشی سے چلتی ہیں، جیسے وہ ماتم کے جلوس کا حصہ ہوں۔ بس پاس سے گذر جائے، تو خبر ہی نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے جیسے ہوا کا ایک جھونکا سرسراتا ہوا نکل گیا ہو۔ جرمنی میں یوں بھی سڑکوں پر گاڑیوں کو ہارن بجانے کی ممانعت ہے اور صرف استثنائی حالات میں، مثلاً ٹکر لگنے کا خطرہ پیدا ہو جانے پر، ان کو ہلکی سی آواز میں چیں کرنے کی اجازت ہے۔ البتہ قبرستان میں یہ آزادی بھی سلب کر لی جاتی ہے۔ کیا مجال ہے کہ پورے قبرستان میں کسی قسم کی کھڑکھڑاہٹ یا شور شرابا سننے میں آئے۔ رونے دھونے یا کھلے بندوں ماتم اور واویلا کرنے کا یوں بھی یورپ میں رواج نہیں ہے۔ بہت ہوا تو پس ماندگان کو اپنی تر آنکھیں پونچھتے ہوئے اور رومال میں ناک سڑکتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فرد اپنا غم نہیں دکھاتا اور نہ ہی کوئی پچھاڑ کھا کر گرتا ہے۔ جنازے میں شرکت کرنے والے پھول لے کر آتے ہیں اور اس روز اپنا بہترین لباس پہنے ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر شرکاء خاص طور پر اس موقعے کے لئے نئے کپڑے خریدتے ہیں، جو عام طور سے کالے رنگ کے ہوتے ہیں، جو ماتم کے لئے مخصوص ہے۔

میں نے بھی اس روز کالا سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے بس لینے کی بجائے پیدل چلنے کا ارادہ کیا، تاکہ گاہے بگاہے سڑک کو چھوڑ کر دائیں بائیں پائی جانے والی قبروں کے قطعات پر نظر ڈالتا چلوں۔ پس ماندگان عام طور سے اپنے عزیزوں کی قبروں پر پھول بوٹے لگاتے ہیں اور مذہبی تہواروں پر یا ان کی برتھ ڈے منانے کے لئے قبروں پر جمع ہوتے اور گویا ان کی معیت میں پکنک کرتے ہیں۔ اب تو یہ رواج ہو چلا ہے کہ قبرستان کی انتظامیہ یا کسی فرم کو بیس پچیس برسوں کے لئے قبر کی دیکھ بھال کا ٹھیکہ دے دیا جاتا ہے۔ یوں بھی قبروں کو پچیس برسوں کے بعد ہموار کر دیا جاتا ہے، تاکہ نئی قبریں پر بنائی جا سکیں۔

موسم خزاں اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی اور اگرچہ اس روز صبح سے دھوپ نکلی ہوئی تھی ہوا میں اچھی خاصی خنکی تھی۔ قبرستان میں زائرین کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ عام طور سے جنازے متعلقین کی سہولت کی خاطر دوپہر کے بعد رکھے جاتے ہیں۔ وہاں پر موجود لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی جنازے میں شرکت کی خاطر آئے تھے یا میری طرح بس یونہی گھوم پھر رہے تھے۔ آخر میرے وہاں پر ہونے کی بھی تو کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھ لیتا کہ تم یہاں پر کیا کرنے آئے ہو، تو میں کیا جواب دے سکتا تھا۔ قبرستان میں سیاحت کی خاطر آنے کا ذکر کرتے

ہوئے مجھے ضرور شرمندگی ہوتی، اس لئے کہ وہاں پر لوگ اپنے عزیزوں کو دفن کرنے یا ان کی قبروں پر سوگ منانے کی خاطر آتے ہیں۔ ان کو پتہ چلے کہ میں اپنے سیاحتی مشغلے کو پورا کرنے کے لئے آیا تھا، تو انہیں یقیناً دکھ ہوگا۔ اس لئے میں بھی دوسروں کی طرح سنجیدہ صورت بنائے ہوئے چل رہا تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ سوگواروں کے ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے تھے اور میں خالی ہاتھ تھا۔

پھر میں نے دیکھا کہ مجھ سے آگے چلنے والے لوگ راستے میں پڑنے والے چیپل کی طرف مڑنے لگے، جو سڑک سے تھوڑے فاصلے پر تھا اور جہاں پر پہلے سے بہت سے لوگ موجود تھے۔ میں بھی ادھر کو مڑ گیا، جیسے مجھے وہیں پر جانا تھا۔ میں نے سوچا کہ قبرستان میں آن نکلا ہوں، تو کیوں نہ لگے ہاتھوں کسی جنازے کی کاروائی بھی دیکھتا چلوں۔ عام طور سے جنازوں میں شرکت پر کوئی پابندی نہیں ہوتی اور جو چاہے ان میں شامل ہوسکتا ہے۔ آج کل تو لوگ شادی بیاہوں بلکہ عام ہاؤس پارٹیوں میں بھی بن بلائے آن گھستے ہیں۔ چیپل کے دروازے پر ماتمی کاروباری ادارے کے کارکن لوگوں سے پھولوں کے گلدستے وصول کر رہے تھے، جن کو قبر تیار ہونے پر مناسب طریق سے سجایا جانا تھا۔ دروازے کے پہلو میں ایک اسٹینڈ بنا ہوا تھا، جس پر کاغذ اور قلم دھرے تھے۔ سب لوگ باری باری اپنے نام ایک فہرست میں درج کرتے جاتے تھے، جس کو آخر میں پس ماندگان کے حوالے کیا جانا تھا۔ میں نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنا نام فہرست میں درج کر دیا اور گویا باقاعدہ طور پر رجسٹرڈ ماتمی بن گیا، جس کی شمولیت پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔

چیپل اچھا خاصا بھرا ہوا تھا۔ مجھے آخری قطار میں سیٹ ملی۔ حاضرین میں کوئی جانی پہچانی شکل دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ میں عام طور سے لوگوں کی صورتوں کو بھول جاتا ہوں اور ان کے نقوش اس طرح میری یادداشت کی سلیٹ پر سے مٹ جاتے ہیں، جیسے کسی نے اس پر گیلا کپڑا پھیر دیا ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مجھے ان کی باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ بعض اوقات لوگ مجھے ملنے کے لئے آتے ہیں اور اگر مجھے پہلے سے ان کے بارے میں بتایا نہ گیا ہو، تو میں ان سے کسی اجنبی کی طرح ملتا ہوں۔ پھر جب وہ مجھے بتاتے ہیں کہ ہماری ملاقات کب ہوئی تھی، تو مجھے اس ملاقات کی ایک ایک بات یاد آ جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ باتیں بھی جن کو میرے ملاقاتی بھلا چکے ہوتے ہیں۔

جب پادری نے اپنے خطبے میں مرحومہ سبیلے مارکس کے بچپن اور نوجوانی کا ذکر شروع کیا اور بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کی یاد تازہ کرانے لگا، تو مجھے اس کی باتیں جانی پہچانی لگیں۔ میں عین اسی

زمانے میں جرمنی میں پہنچا تھا، جہاں پر دولت کی ابھی وہ ریل پیل نہ تھی، جو آج کل دیکھنے میں آتی ہے۔ البتہ اس وقت تک دوسری جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی کساد بازاری کا زمانہ گذر چکا تھا اور جرمن پہلی بار چھٹیوں میں غیر ملکوں کی سیاحت کے لئے جانے لگے تھے۔ مگر ملک میں مکانوں کی کمی تھی، جس کے سبب ایک ایک فلیٹ میں دو اور تین فیملیاں رہ رہی تھیں۔ یونیورسٹی کے طالب علموں کی رہائش کے لئے ہوسٹل نہیں پائے جاتے تھے اور انہیں پرائیویٹ فیملیوں کے پاس کمرہ کرائے پر لے کر رہنا پڑتا تھا۔ طالب علموں کو عام طور سے کسی مہمان کو اپنے پاس ٹھہرانے کی ممانعت تھی۔ بلکہ اگر کوئی ملنے والا آتا تھا، تو اس کو شام کے دس بجے سے پہلے فلیٹ سے رخصت ہونا پڑتا تھا۔ بیشتر گھروں میں سرے سے کسی لڑکی کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت نہ تھی۔

پادری بتا رہا تھا کہ سبیلے کے ماں باپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا باپ جنگ کے خاتمے پر روسی قید میں تھا اور ماں کو بیٹی سمیت ایک فیملی کے ساتھ مل کر ایک مختصر فلیٹ میں رہنا پڑا تھا۔ ان کے پاس صرف ایک کمرہ تھا، جس میں ان کو نہ صرف سونا، بلکہ کھانا بھی پکانا ہوتا تھا۔ گویا سبیلے کا واسطہ پہلے دن سے تنگی اور عسرت سے پڑا تھا، جس پر قابو پانا اس کی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج بن گیا تھا۔ وہ سارا دن ایک فرم میں سیکرٹری کے طور پر کام کرنے کے بعد شام کو ایک ایوننگ اسکول میں پڑھنے کے لئے جاتی تھی، جس کا سلسلہ برسوں تک چلتا رہا۔ تب کہیں جا کر وہ جمنازیم کا آخری امتحان ابیٹوُر پاس کر سکی تھی، جس کے بغیر جرمنی میں یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ اس طرح اس کی ماں کی عمر بھر کی خواہش پوری ہوئی تھی، جو خود تو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہ کر سکی تھی، مگر چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کو یہ چانس ملے۔

جرمنی میں لڑکیوں کے ناموں میں سبیلے کچھ ایسا عام نہیں ہے۔ خال خال اس نام کی لڑکیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اتفاق ایسا تھا کہ میں طالب علمی کے دنوں میں اس نام کی ایک لڑکی کو جانتا تھا، جس کو میں نے پہلی بار یونیورسٹی کے کیفے ٹریا میں دیکھا تھا۔ میانہ قد، قدرتی بلونڈ، مضبوط ہاتھ پاؤں، بلیوں جیسی نیلی آنکھیں۔ ایک میں ہی نہیں دوسرے طالب علم بھی اس کے حسن پر نثار ہونے کو پھرتے تھے۔ مگر وہ ہم سب کو نظر انداز کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ میرے دوستوں میں سے کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کون تھی اور کیا پڑھتی تھی۔ ہمیں تو یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ سرے سے یونیورسٹی کی طالبہ علم ہی نہیں۔ اس زمانے میں بہت سی لڑکیاں اور لڑکے یونیورسٹی کے کیفے ٹریا میں شام کے وقت جمع ہو جاتے تھے۔ میں نے جانا

کہ وہ بھی ان میں سے ایک ہوگی۔ پھر ایک روز میں کیفے ٹریا میں چائے کی پیالی اور کیک اٹھائے ہوئے بیٹھنے کے لئے خالی کرسی کی تلاش میں گھوم رہا تھا کہ اس نے مجھے یہ بتانے کے لئے اشارہ کیا کہ اس کے پہلو میں پڑی ہوئی کرسی خالی ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ اس نے جواب میں اپنا نام بتایا اور کہا کہ وہ مجھے فلسفہ کے پروفیسر وائیس ایکر کے لیکچروں میں کئی بار دیکھ چکی ہے۔ یہ لیکچر جمعرات کی شام کو یونیورسٹی کے بڑے ہال میں ہوتا تھا اور اس میں شمولیت کے لئے ساری یونیورسٹی امڈ پڑتی تھی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سبیلے بھی ان لیکچروں کو سنتی تھی۔ اس طرح ہمیں بات کرنے کے لئے موضوع مل گیا۔ بلکہ ہم کیفے ٹریا سے اٹھ کر اگلے اس روز لیکچر سننے کے لئے گئے، جو دس بجے ختم ہوتا تھا اور جس کے بعد ہر کسی کو گھر پہنچنے کی جلدی ہوتی تھی۔ مجھے سحری کے وقت اٹھنا اور مزدوری کی خاطر اپنی جاب پر پہنچنا تھا۔ سبیلے نے کہا کہ اسے بھی سویرے سویرے فرم میں جانا تھا، جہاں پر وہ سیکرٹری تھی۔ ہم نے اگلے روز شام کے وقت کیفے ٹریا میں ملنے کا وعدہ کیا۔ میں اس رات ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا۔ مجھے اپنی خوش بختی پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

اس کے بعد ہمارا مل بیٹھنا روز کا معمول بن گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرے سوا وہاں پر کسی کو نہیں جانتی تھی اور شاید جاننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اگر میں نے کسی دوست یار سے اس کا تعارف کرانا چاہا، تو اس نے کسی قسم کی گرمجوشی نہ دکھائی۔ میرے دوستوں کا خیال تھا کہ سبیلے کی ناک بہت اونچی ہے۔ مگر اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا کہ مجھ میں بھلا کونسا سرخاب کا پر لگا ہوا تھا کہ وہ میرے ساتھ دوستی کرنے کو پھرتی تھی۔

پھر ایک روز اس نے مجھے اپنے دوستوں کے ہاں چلنے کو کہا، جو ہفتے میں ایک بار ملتے تھے اور ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ ان دنوں میں وہ دیس دیس کی لوک کہانیاں مل کر پڑھ رہے تھے اور اس بارے میں گفتگو کرتے تھے کہ ان کہانیوں کے پیچھے کیا حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ مجھ سے وہ ہندوستان کے فولک کلچر پر بات کرنا چاہتے تھے۔ پتہ چلا کہ ان میں سے اکثر اسکول کے زمانے میں سبیلے کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ ان میں سے دو یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے، جب کہ دوسرے بنکوں یا دیگر کمرشل اداروں میں ملازم تھے۔ مگر سبیلے کے سوا وہاں پر اور کوئی لڑکی موجود نہ تھی۔ وہاں پر بھی میں نے محسوس کیا کہ سبیلے کی سب کے ساتھ دوستی تھی، مگر یاری کسی کے ساتھ نہ تھی۔ خود میری حیثیت ایک اچھے واقف کار سے بڑھ کر نہ تھی۔ میں نے اگر کبھی اس بارے میں اس سے بات کرنا بھی چاہی، تو وہ ٹال گئی۔ میرے

دوستوں کا کہنا تھا کہ اس کی توقعات بہت اونچی ہیں اور وہ شاید کسی شہزادے کی راہ تک رہی ہے۔

میں اپنی طالب علمی کے دنوں کی یادوں میں ڈوبا ہوا کہیں کا کہیں نکل گیا تھا۔ پھر میں نے پادری کو کہتے ہوئے سنا کہ سبیلے مارکس نے بہت متنوع زندگی بسر کی تھی۔ مگر وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ آیا وہ اس زندگی سے خوش بھی تھی یا نہیں۔ قرین قیاس تھا کہ اس کے ماں باپ کے درمیان پیدا ہو جانے والی ناچاقی کا اثر سبیلے اور اس کے بھائی پر بھی پڑا ہوگا، کیونکہ معاملہ طلاق تک پہنچا تھا۔ بچے ماں کے ساتھ مقیم رہے تھے، جب کہ باپ ایک دوسری عورت کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ سبیلے کا بھائی اپنے باپ کے بہت قریب تھا، جب کہ سبیلے نے باپ سے ملنا تک چھوڑ دیا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ میری واقف کار سبیلے کے ماں باپ کے درمیان بھی ناچاقی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا باپ اچھا خاصا مالدار تھا، مگر ماں کو اتنی تھوڑی رقم خرچ کے لئے دیتا تھا کہ اس کو گھر کا خرچ چلانے کے لئے ملازمت کرنی پڑتی تھی۔ اسکول کے دنوں میں سبیلے ایک اخبار اپنے محلے کے خریداروں میں تقسیم کر کے تھوڑے سے پیسے کماتی رہی تھی۔ صرف اس کا بھائی اس طرف نہیں جاتا تھا۔ سبیلے کو شبہ تھا کہ جب وہ ہفتے کے ہفتے باپ کو ملنے کے لئے جاتا تھا، تو وہاں سے اس کو پیسے مل جاتے تھے، جو اتنے کھلے ہوتے تھے کہ صاحبزادے نے چھوٹی عمر میں ہی سگریٹ نوشی کی لت ڈال لی تھی۔ ماں کو اس بات کا بہت دکھ تھا۔ اور جب کبھی سبیلے کا باپ ان کے گھر آتا تھا، تو اس بات پر دونوں کے درمیان خوب جھڑپ ہوتی تھی۔

پادری نے بیان کیا کہ سبیلے مارکس پوری پوری آرٹسٹ تھی۔ بچپن میں اس کو پیانو بجانا سکھایا گیا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ اس میں صلاحیت پائی جاتی ہے اور اگر وہ باقاعدگی سے مشق کرتی رہی، تو بہت بڑا نام پیدا کرے گی۔ مگر اس نے پیانو بجانا چھوڑ دیا اور بیلے ڈانس کی کلاسیں لینے لگی۔ یہاں بھی اس کو سراہا گیا اور اسے ایک دو بار اوپیرا ہاؤس میں پرفارمنس کا موقعہ ملا۔ بہت جلد اس سے بھی اس کا جی بھر گیا اور اس نے ڈیزائن اور فیشن کے کپڑوں کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ پھر ایک بار کامرانی اس کے قدموں کو چھومنے لگی۔ مگر اس کی طبیعت میں ایسا تلون پایا جاتا تھا کہ اس کام سے بھی اس کا جی اوب گیا۔ اس نے ایک امریکن سے شادی کی اور گھر بھی بسایا۔ مگر بے اولاد رہی۔ آخری برسوں میں وہ ہمبرگ لوٹ آئی تھی، جہاں کا وہ پودا تھی اور جہاں پر اس کے دوست بستے تھے۔ جنازے میں شریک ہونے والوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے شبہ نہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کا اپنے دوستوں پر اعتماد غلط نہ تھا۔

آخر میں کالے کپڑوں میں ملبوس جنازے کے چھ کہار چیپل کے پچھلے دروازے سے داخل ہوئے اور تعظیم کی خاطر مرنے والی کے آگے اپنے ہیٹ اتار کر سر جھکانے کے بعد تابوت کو اٹھا کر باہر کی طرف چل دیئے۔ پہلی قطار میں بیٹھنے والے ان کے پیچھے اور پھر دوسری اور تیسری قطار والے باہر نکلے۔ میں چونکہ آخری قطار میں بیٹھا تھا، اس لئے میری باری سب سے آخر میں آئی۔ چیپل کے دروازے پر مرنے والی کے پس ماندگان کھڑے تھے، جن کے ساتھ باہر نکلنے والے اظہار تعزیت کرتے تھے۔ میں نے بھی ایسا کیا اور دوسروں کی طرح میرے ہاتھ میں بھی ایک کارڈ تھما دیا گیا، جو قبرستان کے بڑے گیٹ پر واقع ایک ریستوراں کا تھا۔ پس ماندگان کی طرف سے سب کو تدفین کے بعد وہاں پر جمع ہونے اور تعزیتی عصرانے میں شامل ہونے کی دعوت تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے وہاں پر جا کر کیا لینا ہے۔ میں ماتم میں شریک ہونے والوں میں سے کسی کو نہیں جانتا اور مرنے والی سے بھی واقفیت نہیں رکھتا۔ اس لئے میرا وہاں پر جانا بیکار ہے۔ اب اگلا مرحلہ تدفین کا تھا۔ عیسائی رسوم و رواج کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں تدفین بھی دیکھ لی جائے، تو حرج کی بات نہیں۔ تدفین کے بعد میرا ارادہ چپکے سے وہاں سے کھسک جانے کا تھا۔

جنازے کے پیچھے ماتمی جلوس کھدی ہوئی قبر کی طرف، جو وہاں سے زیادہ دور نہ تھی، بطخوں کی چال میں روانہ ہوا۔ اکثر لوگ دو دو کی جوڑیوں میں جا رہے تھے۔ صرف میں اکیلا تھا اور سب سے آخر میں چل رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان عورت میری طرح چھڑی چھانٹ تھی۔ اس کو بھی شاید کوئی جوڑی نہ ملی تھی۔ عین اس لمحے میں جب میں اس کی طرف تک رہا تھا، اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے آگے بڑھ کر میرے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا، جیسے ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے ہوں۔ تابوت کے قبر میں اتارے جانے کے بعد پادری نے بائیبل میں سے چند آیات پڑھ کر سنائیں اور کھلی ہوئی قبر کے پہلو میں پڑے ہوئے ایک کھرپے کو اٹھا کر تین بار مٹی کو قبر پر ڈالتے ہوئے مٹی کے مٹی میں مل جانے کی بات کی۔ اس کی پیروی میں باری باری سارے سوگواروں نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے پھول تابوت پر نچھاور کئے اور پھر تین تین مٹھیاں مٹی کی اس پر ڈالیں۔ اس کاروائی پر بہت سا وقت لگ گیا۔ سب سے آخر میں ہماری باری آئی اور میں نے اور میری جوڑی والی عورت نے قبر پر مٹی ڈالی۔ اس سارے عرصے میں ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی، البتہ اس کے جسم سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو مجھے مسحور کر رہی تھی۔ میں نے قیاس کیا

کہ وہ مرحومہ سبیلے مارکس کی سہیلی ہوگی۔اب مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اگر میری جوڑی والی محترمہ تعزیتی عصرانے میں شرکت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، تو پھر میرے لئے وہاں سے چپکے سے کھسک جانا ممکن نہ ہوگا۔یوں بھی اب میں اکیلا نہ تھا اور محترمہ کی معیت میں نہ صرف تعزیتی محفل میں، جہاں پر کافی اور کیک ملنے کی امید کی جاسکتی تھی، بلکہ کہیں بھی جانے کے لئے تیار تھا۔

جب سب لوگ کھلی قبر پر مرحومہ سبیلے سے رخصت لے چکے اور ابھی اس پر مٹی ڈال کر ہموار کرنے کا مرحلہ باقی تھا، جو بعد میں گورکن سرانجام دیتے ہیں، تو سوگواروں کا قافلہ ریستوراں کی طرف چل دیا۔میری جوڑی والی محترمہ بدستور میرے بازو میں بازو ڈالے ہوئے تھی۔اس نے کہا کہ اس کا نام یوں تو کاتھرین ہے، مگر میں اس کو کاتھی کے نام سے پکار سکتا ہوں۔مرحومہ سبیلے کے بارے میں اس نے کہا کہ اس کے ساتھ اس کی دوستی نہیں تھی۔بس وہ ایک دوسرے کو جانتی تھیں، جیسے ایک ہی بلڈنگ میں رہنے والے ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں۔

جب ہم ریستوراں میں پہنچے، تو گول میز اور دوسری مرکزی سیٹوں پر لوگ قبضہ جما چکے تھے۔ ہمارے لئے ایک چھوٹے میز پر، جو جرمن محاورے میں "بلیوں کا میز" کہلاتا ہے، دو کرسیاں باقی بچی تھیں۔کاتھی میرے پہلو سے لگ کر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی، جیسے ہم سچ مچ ایک نو بیاہتا جوڑا ہوں۔ سبیلے کے بھائی نے اپنے خاندان کی طرف سے اور اپنی مرحومہ بہن کے نام پر سب حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔اس کے لئے یہ امر ڈھارس بندھانے کا موجب تھا کہ سبیلے کے دوست یار بڑی تعداد میں اس کی تدفین کے موقعے پر موجود تھے۔کاش وہ اس امر کو خود دیکھ سکتی اور اس کا دوستوں کی کمی کا گلہ دور ہو جاتا، جس کا اظہار وہ آخری برسوں میں کیا کرتی تھی۔

پہلا دور کافی اور کیک کا چلا۔اکا دکا کونیاک اور وہسکی کے آرڈر بھی دیئے جانے لگے۔آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر ہر طرف شراب کی بوتلیں کھل رہی تھیں اور سوگواروں کی دھیمی آوازیں لطیفوں اور قہقہوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ریستوراں کے ویٹر اس قدر تیزی سے آرڈر لے اور سامان خورد و نوش لا رہے تھے، جیسے ہم قبرستان کے پہلو میں نہیں بیٹھے تھے، بلکہ منڈی مویشیاں کے بیچوں بیچ پھنسے ہوئے تھے۔شور بڑھتا جا رہا تھا اور مجھے پہلو میں بیٹھی ہوئی کاتھی کی بات کو سمجھنے میں دقت ہو رہی تھی۔جوں جوں شراب کا نشہ لوگوں کے سروں میں چڑھتا جاتا تھا، توں توں ان کی آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی جاتی تھیں۔سوگواری کی فضا عیش کوشی میں ڈھل چکی تھی۔

میں اس ماحول سے کسی قدر بدمزہ ہو رہا تھا۔ میں نے کاتھی سے کہا کہ کسی دوسری جگہ پر چل کر بیٹھتے ہیں۔ مگر وہ وہاں سے اٹھنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس نے کہا: کیوں اپنی جیب سے پیسے خرچ کرنے کو پھرتے ہو۔ یہاں پر ہر چیز مفت میں ملتی ہے۔ کھاؤ، پیؤ اور عیش کرو۔ سبیلے کا جنازہ روز روز نہیں اٹھتا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گی کہ ہم نے اس کے غم کو کس طرح غلط کیا تھا۔

محفل کہیں آدھی رات کو جا کر ختم ہوئی۔ سوگواروں کا گروپ ریستوراں سے باہر نکلا، تو سب کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور وہ ایک دوسرے کو سہارا دے کر چل رہے تھے۔ کاتھی نے پھر سے میرا بازو سنبھال لیا تھا۔ مگر اب وہ شراب کے نشے سے جھوم رہی تھی۔ اس نے کہا: جہاں چاہو مجھے لے چلو۔ اور اگر تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، تو پھر میرے ساتھ آؤ اور آج کی رات میرے گھر پر رہو۔ مجھے اس بات کے تصور سے ہی ابکائی آ رہی تھی کہ شراب کے نشے میں چور عورت کے پہلو میں جا کر رات گذاروں۔ میں نے اس کی دعوت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اس کی پیش کش کو کسی دوسرے موقعے پر کیش کروں گا۔

چند روز کے بعد کاتھی کا فون آیا اور اس نے مجھے اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی اس نے بتایا کہ سبیلے کا ذاتی سامان، جو آخر دم تک اسی بلڈنگ میں مقیم رہی تھی، بک رہا تھا۔ اس غرض کے لئے اس کے فلیٹ کو "اوپن ہاؤس" قرار دے دیا گیا تھا۔ جو کوئی چاہے اس روز فلیٹ میں گھوم پھر کر اپنی پسند کی چیزیں چن لے اور قیمت ادا کر کے ان کو ساتھ لیتا جائے۔ میں نے کہا کہ ایک خاتون کے فلیٹ میں بھلا ایک مرد کے لئے کونسی چیز ہوگی، جس کو حاصل کرنے کی مجھے خواہش ہو سکتی ہے۔ کاتھی نے کہا کہ چیزوں پر ایک نظر ڈالنے میں کیا حرج ہے۔ اور پھر مجھے اس کی دعوت کا پاس کرنا چاہیئے، جو ابھی تک قائم ہے۔ مجھے یاد آیا کہ سچ مچ اس نے مجھے اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی تھی اور میں نے اسے قبول کرتے ہوئے کہا تھا کہ وقت اور دن ہم بعد میں طے کر لیں گے۔

میں کاتھی کے ہاں پہنچا، تو وہ سبیلے کے فلیٹ میں جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہاں پر لوگوں کی خوب ریل پیل ہوگی۔ مگر میری توقع کے برعکس بس ایک دو ہمسائے گھر کی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ہم نے سارے کمروں کا چکر لگانے کے بعد ڈرائینگ روم کی ایک الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھنا شروع کیا۔ کاتھی کا خیال تھا کہ مجھے کوئی نہ کوئی نادر کتاب ضرور مل جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ کتابیں زیادہ تر جرمن ادب سے متعلق تھیں اور سب میری پڑھی ہوئی تھیں۔ یوں بھی بیشتر کتابیں پیپر بیک تھیں اور ان کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ کتابیں انسان اس سے بہتر حالت میں کسی بھی

اسٹور میں خرید سکتا ہے، جہاں پر نیا ایڈیشن چھپنے سے پہلے سابقہ ایڈیشن کی باقی ماندہ کتابیں ردی کے بھاؤ بکتی ہیں۔

اس دوران میں کاتھی نے دوسری الماری میں رکھے ہوئے فوٹو البم نکال لئے تھے اور ان کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اچانک وہ ایک تصویر پر آن کر رک گئی۔ لگتا تھا کہ وہ کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں کتابوں کو الماری میں واپس رکھنے کے بعد اس کی طرف گیا، تو کاتھی نے مجھ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور پوچھا: کیا یہ تصویر تمہاری نہیں ہے؟

میں نے فوٹو البم کو اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے تصویر پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ سچ مچ میری تصویر تھی، جو اس شام کھینچی گئی تھی، جب میں سبیلے کے ساتھ اس کے دوستوں کی محفل میں شامل ہونے کے لئے گیا تھا، جو دیس دیس کی لوک کہانیاں مل کر پڑھتے تھے اور مجھ سے ہندوستان کے فولک کلچر پر بات کرنا چاہتے تھے۔

اب اس بات میں کوئی شبہ باقی نہ تھا کہ میں اسی سبیلے کے جنازے میں شریک ہوا تھا، جس کے ساتھ مجھے طالب علمی کے زمانے میں پیار تھا۔ تصویر کے نیچے سبیلے نے لکھ رکھا تھا: "لافانی عشق، جس کو میں ساری عمر نہ بھلا سکوں گی۔"

(کمرفیلڈ۔ جرمنی۔ ۷ اگست ۲۰۰۲ء)

اعتماد شکنی

جب مجھے لمبے وقفے کے بعد پچھلے دنوں برلین سے ایک تقریب میں شامل ہونے کی دعوت ملی، تو میں نے اپنے دوسرے سارے ضروری اور غیر ضروری کاموں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اسے قبول کر لیا، کیونکہ امید کی جاسکتی تھی کہ وہاں پر لوئیزے سے ملنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ ہماری ملاقات آخری بار کب ہوئی تھی۔اس بات پر انیس بیس برس تو ضرور ہو گئے ہوں گے۔ میں ٹیلی ویژن کی ایک ٹاک شو میں شرکت کے سلسلے میں برلین میں تھا، جس کا پروگرام آدھی رات کو ٹیلی کاسٹ ہونا تھا۔ اور جیسا کہ ان پروگراموں میں اکثر ہوتا ہے، مجھے بہت شارٹ نوٹس پر شمولیت کی دعوت ملی تھی اور میں چلنے سے پہلے لوئیزے سے فون پر رابطہ نہ کر سکا تھا۔ اس زمانے میں اس کے گھر پر فون کی ریکارڈنگ کا انتظام نہیں تھا، اس لئے پیغام نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی ہسپتال میں مستقل طور پر رات کی تھی، جہاں سے سویرے سویرے واپسی پر اسے سونا ہوتا تھا۔اور مجھے پتہ تھا کہ وہ صبح کے وقت فون نہیں اٹھاتی۔ اگلے روز میرا واپسی کا جہاز پچھلے پہر تین بجے جانا تھا، اس لئے اگر میں لوئیزے سے ایک یا دو بجے کے لگ بھگ رابطہ کر بھی لیتا، تب بھی ملاقات مشکل تھی۔ پھر بھی میں نے فون کر دیا اور لائن کے دوسرے سرے پر خوشی کے مارے لوئیزے کی چیخ نکل گئی۔

"تم کب سے برلین میں ہو اور مجھے بتا کر کیوں نہیں آئے"۔اس نے گلہ کیا۔

"تم سے کل فون پر رابطہ نہ ہو سکا تھا۔اور اب مجھے خطرہ ہے کہ ہماری ملاقات نہ ہو سکے گی، کیونکہ مجھے فوری طور پر ہوائی اڈے کے لئے روانہ ہونا ہوگا، جہاں پر پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگ جائے گا"۔

"تم انڈر گراونڈ سے چلو اور میں کار سے وہاں پر پہنچ رہی ہوں"۔لوئیزے نے کہا۔

اور پھر سچ مچ جب میں ائر پورٹ پر پہنچا، تو لوئیزے گیٹ پر مجھے اپنے کلابے میں لینے کے لئے

دونوں بازو پھیلائے ہوئے کھڑی تھی۔

لوئیزے ایک عجیب شئے ہے۔ دل کی سچی۔ بات کی پکی۔ دوستوں کی دوست۔ اس کے چہرے پر ہر وقت بشاشت پھیلی رہتی ہے۔ ایسے لمحوں میں بھی لوئیزے کے ماتھے پر کوئی سلوٹ نظر نہیں آتی، جب دوسرے لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ وہ ہر پریشانی اور بڑی سے بڑی نحوست کو ایک قہقہہ لگا کر پرے دھکیل دیتی ہے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ بیوقوفوں کی جنت میں بستی ہے یا ہپیوں کی مانند بس لمحہ موجود کے لئے جیتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی زندگی میں سکھ کی گھڑی شاید کبھی نہیں آئی۔ کوئی دوسرا اس کی جگہ پر ہوتا، تو شکست مان لیتا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاتا اور خودکشی کر لیتا۔ مگر لوئیزے کسی چٹان کی طرح ہے، جو سمندر کے بیچوں بیچ کھڑی ہے اور طاقتور لہریں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

لوئیزے سے میرا ملنا اتفاقی طور ہوا تھا۔ ہمارے ایک مہمان کو ہمبرگ کی بندرگاہ دیکھنے کا شوق تھا، جو ٹورسٹوں میں بہت مقبول ہے۔ لانڈنز بروکن سے ہر آدھ گھنٹے کے بعد کشتیاں چلتی ہیں، جو دو تین گھنٹوں میں بندرگاہ کی ساری گودیوں کی سیر کرا دیتی ہیں۔ ہم نے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی ایک طرحدار اور چھلبلی عورت کو برلین کے مخصوص لہجے میں اپنی تین چار سالہ بیٹی کی دل لگی کے لئے ہمبرگ پر پھبتیاں کستے ہوئے سنا۔ برلین کے باسی اپنے مخصوص مزاح کے سبب منہ پھٹ مشہور ہیں، جس پر وہ بجا طور پر فخرمند ہیں، کیونکہ ان کے منہ سے مزاح کی پھلجڑیاں چھوٹتی رہتی ہیں۔ ماں بیٹی کے تیکھے فقرے اور ان کی زندہ دلی سے کشتی کے مسافر بے حد محظوظ ہو رہے تھے اور مجھے اپنے مہمان کے اصرار پر رننگ کمنٹری کرنی پڑتی تھی۔ سیر کے خاتمے پر کشتی سے اترتے ہوئے میں نے ان کو شہر کی سیر کرانے کی پیش کش کی، جس کو انہوں نے خوشی سے قبول کیا اور سارا دن ہمارے ساتھ گذارا۔

رخصت کے وقت لوئیزے نے مجھے برلین آنے کی دعوت دی اور کہا کہ وہ مجھے اپنا شہر دکھائے گی۔ میں نے وعدہ کیا کہ جب کبھی آنا ہوا، تو میں اطلاع کر دوں گا۔ ایسا موقع جلد ہی پیدا ہو گیا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے پیدا کر لیا تھا۔ لوئیزے مجھے لینے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی۔ میرے لئے کمرہ ہوٹل میں بک تھا، مگر لوئیزے نے کہا کہ اس کے ہوتے ہوئے مجھے ہوٹل میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے خاص طور پر میرے قیام کے دنوں کے لئے رخصت لے رکھی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی سونیا کو کسی سہیلی کے ہاں بھیج دیا تھا، جہاں پر اس کو دو راتیں سونا تھا۔ اس نے کہا کہ سونیا کی موجودگی میں ہم کھل کر ایک دوسرے سے باتیں نہ کر سکتے۔ اس کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے، مگر وہ سب کچھ سمجھتی

ہے اور موقع محل دیکھے بغیر بھری مجلس میں الٹے سیدھے سوالات کرنے لگتی ہے۔

میں نے لوئیزے سے سونیا کے باپ کے بارے میں پوچھا، تو اس نے کہا کہ وہ جرمنی کے سب سے بڑے قید خانے میں بند ہے۔ میں نے اس کے قید خانے میں بند ہونے کا سبب جاننا چاہا، تو لوئیزے نے قہقہہ لگا کر بتایا کہ اس قید خانے کا دوسرا نام جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک ہے، جس کے باسیوں کو اپنے ملک کو چھوڑنے کی سختی سے ممانعت ہے۔ حکومت کو بجا طور پر یہ خطرہ ہے کہ وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

"کیا تم بھی مشرقی جرمنی سے ہو؟" میں نے جاننا چاہا۔

"ہاں اور نہ" لوئیزے نے ہنستے ہوئے جواب دیا: "میں یوں تو مغربی برلین کی رہنے والی ہوں، مگر سونیا کے باپ ہانس کی خاطر مشرقی جرمنی چلی گئی تھی۔ اس زمانے میں شہر کے دونوں حصوں کے باسیوں کو آزادی کے ساتھ ادھر ادھر آنے جانے کی آزادی تھی۔ بیشمار لوگ شہر کے ایک حصے میں رہتے اور دوسرے حصے میں کام کرتے تھے۔ خاص طور پر مغربی جرمنی کی فری یونیورسٹی کے بہت سے طالب علم مشرقی برلین میں کمرہ کرائے پر لے کر رہتے تھے، کیونکہ وہاں پر رہائش سستی پڑتی تھی اور کھانے پینے کی چیزیں بہت کم داموں میں ملتی تھیں۔ میری ماں نے مجھے بہت روکا، مگر میں اس کی مرضی کے خلاف مشرقی جرمنی منتقل ہو گئی تھی اور وہ بھی برلین کی دیوار کے بنائے جانے سے صرف ڈیڑھ مہینہ پہلے۔ یہ میری زندگی کی پہلی تو نہیں، البتہ سب سے بڑی بیوقوفی تھی، کیونکہ جانے کو تو میں اپنی مرضی سے گئی تھی، مگر واپسی صرف سرکاری اجازت سے ممکن تھی، جو عام طور سے نہیں ملتی تھی"۔

"گویا تم ادھر جا کر پھنس گئی تھیں۔ کیا تمہاری ماں تمہیں ملنے کیلئے مشرقی جرمنی نہیں جا سکتی تھی؟"

"صرف مغربی جرمنی میں رہنے والوں کو دن بھر کے لئے ادھر جانے کی اجازت تھی۔ جب کہ مغربی برلین کے باسیوں کو شہر کے مشرقی حصے میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے فون پر بات کر سکتے تھے۔ مشکل البتہ یہ تھی کہ مشرقی جرمنی میں بہت کم پرائیویٹ گھروں میں فون ہوتے تھے۔ یوں بھی فون اور ڈاک پر کڑی سنسر شپ لگی ہوئی تھی۔ اس لئے ڈر کے مارے لوگ کھل کر ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص مثلاً ٹیلی فون پر ایسی جرات کر بیٹھتا تھا، تو اس کی لائن کٹ جاتی تھی۔ خط و کتابت قریب قریب ناممکن تھی، کیونکہ ایک ایک سطر کو دونوں طرف کی سنسر شپ والے پڑھتے تھے اور یہ ان کی مرضی پر منحصر تھا کہ خط کو مکتوب الیہ تک آگے جانے دیں یا روک

لیں۔ یوں بھی خط کہیں دو تین مہینوں میں پہنچتے تھے۔"

"تو گویا تمہارا رابطہ اپنے خاندان سے کٹ گیا تھا۔" میں نے جاننا چاہا۔

"یوں کہہ لو کہ مشکل ہو گیا تھا، بالکل کٹا نہیں تھا، کیونکہ میری بہن مغربی جرمنی میں رہتی تھی اور کبھی کبھی مجھے ملنے کیلئے آ جاتی تھی۔ بلکہ یہ اسی کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ میں مشرقی جرمنی سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اگر وہ نہ ہوتی تو میں شاید آج بھی اس قید خانے میں بند ہوتی۔" لوئیزے کی آنکھوں میں اپنی بہن کے لئے تشکر کے آنسو جھلملا رہے تھے۔

"مجھے تمہاری بہن کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ تمہیں کیسے مشرقی جرمنی سے نکال سکی؟"

"کارین برمین میں رہتی ہے۔ اس نے ایک ایسے گروپ کے ساتھ رابطہ کیا، جو مشرقی برلین سے لوگوں کو سمگل کرتا تھا۔ اس کام کا کارین کو اچھا خاصا معاوضہ ادا کرنا پڑا تھا، جس کے سبب میں آج تک اس کی ممنون اور مقروض ہوں۔"

"تمہارا خاوند کیوں تمہارے ساتھ نہ آیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اسے میرے پلان کا علم نہ تھا۔ یوں بھی ہمارے درمیان ایک خلیج پیدا ہو چکی تھی، جس کو پاٹا نہ جا سکتا تھا۔ دراصل وہ میرا خاوند نہیں، البتہ سونیا کا باپ ہے اور میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ وہ ایک روز مجھ سے شادی کر لے گا۔ مجھے اپنی خوش فہمی کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ دوسری طرف میں ماں کی بات ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اسقاط حمل کرا لوں اور ہانس کو بھول جاؤں"۔

"تم کو کس طریق سے سمگل کیا گیا تھا؟"

"کارین نے جس گروپ سے رابطہ کیا تھا، اس نے مغربی برلین کو مشرقی برلین سے جدا کرنے والی دیوار کے نیچے ایک سرنگ لگائی تھی، جو ایک طرف کھڑے مکان کے تہہ خانے سے دوسری طرف کے ایک مکان کے تہہ خانے تک جاتی تھی اور اندازاً پچاس ساٹھ میٹر لمبی تھی اور اتنی تنگ تھی کہ انسان کو اس میں پیٹ کے بل لیٹ کر کیڑوں کی طرح رینگنا پڑتا تھا۔ میری مشکل یہ تھی کہ سونیا ابھی چھ ماہ کی بچی تھی اور خطرہ تھا کہ وہ سرنگ کے اندھیرے اور اس کی تنگی سے گھبرا کر کہیں رونے نہ لگ جائے، جس کے سبب بارڈر پر متعین پولیس کو پتہ چل جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے سونیا کو افیون کی گولی کھلا کر سلانے کے بعد ایک ٹوکری میں لٹا دیا گیا، جو مجھے اپنے آگے دھکیل کر لے جانی تھی۔ مجھے سرنگ کے ایک سرے سے

دوسرے سرے تک پہنچنے میں شاید آدھا یا پون گھنٹہ لگا ہوگا۔ مگر چونکہ کسی لمحے بھی راز کھل جانے کا خطرہ تھا، اس لئے مجھے یہ وقفہ بے حد لمبا لگا تھا۔ اور اب بھی بعض اوقات میں خواب میں اپنے آپ کو سرنگ میں رینگتے ہوئے دیکھتی ہوں اور جب بیدار ہوتی ہوں، تو پسینے میں شرابور ہوتی ہوں۔"

مشرقی جرمنی کی حکومت نے لوئیزے پر ری پبلک سے فرار ہونے کا الزام عاید کیا اور ہانس کو کہا گیا کہ لوئیزے پر سونیا کو باپ کی مرضی کے خلاف اغوا کرنے کے الزام میں عدالت میں مقدمہ دائر کرے۔ لوئیزے نے ہانس کو لکھ کر دے رکھا تھا کہ آپس کے تعلقات ٹوٹنے اور ان کی علیحدگی کی صورت میں وہ سونیا کے سلسلے میں اپنے جملہ حقوق سے اس کے حق میں دستبردار ہوتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس طرح اسے اپنی بے پایاں محبت اور اس پر اپنے مکمل اعتماد کو دکھا کر اس کو مستقل طور پر اپنے قابو میں رکھ سکتی تھی۔ لوئیزے نے کہا کہ یہ اس کی زندگی کی دوسری بڑی بیوقوفی تھی، جس پر وہ بے حد رنجیدہ تھی۔ ہانس کو مغربی جرمنی کی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کے سلسلے میں مشرقی جرمنی کی اشتراکی حکومت کی طرف سے مالی امداد دی گئی۔ لوئیزے کو یہ مقدمہ اکیلے لڑنا پڑا اور اس پر اٹھنے والے اخراجات خود اٹھانے پڑے۔ چونکہ ہانس نے باضابطہ طور پر سونیا کو اپنا متبنیٰ نہیں بنایا تھا، اس لئے قانون کی نظر میں اس کا سونیا کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ذاتی طور پر ہانس کو لوئیزے سے یہ شکایت تھی کہ وہ اسے بتائے بغیر چلی گئی تھی۔ اسے پتہ ہوتا، تو وہ بھی اس کے ساتھ آتا۔ مگر یہ بات وہ عدالت کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا۔ یوں بھی اس کو اپنے مقدمے کی پیروی کی خاطر مغربی برلین آنے نہیں دیا گیا تھا۔ مشرقی جرمنی کی حکومت کو خطرہ تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گا۔

لوئیزے نے مغربی برلین آنے کے بعد نرسنگ کی ٹریننگ لی، جس کے دوران اس کی ماں نے سونیا کی دیکھ بھال کی اور ماں بیٹی اس کے پاس ہی مقیم رہی تھیں۔ سونیا کی باتیں سن کر یہ احساس ہوتا تھا کہ ایک چار پانچ برس کی بچی کے منہ سے اس کی نانی بول رہی ہے۔ وگرنہ اتنی سمجھ دار باتیں اس کو بھلا کیسے سوجھ سکتی تھیں۔ اس نے ماں کو اس کے ایک دوست فریڈریش کے بارے میں کہا تھا کہ اس کو بھول جائے۔ وہ کبھی اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ یوں بھی سونیا نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کا باپ بنے۔

"سونیا کو کوئی مرد پسند نہیں آتا۔ اس وجہ سے میں نے واقف کاروں کو اپنے ساتھ گھر لانا چھوڑ دیا ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ سونیا کو اپنا باپ یاد ہے اور وہ اس کی طرف واپس جانا چاہتی ہے۔" لوئیزے نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"ہوسکتا ہے کہ وہ کسی مرد کے ساتھ تم کو شیئر نہیں کرنا چاہتی۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ جب وہ چھوٹی تھی اور اپنی سہیلیوں کے باپوں کو دیکھتی تھی، تو اکثر کہا کرتی تھی: "ماں، تم کیوں ایک باپ نہیں خرید لیتی ہو۔" وہ سمجھتی تھی کہ کھلونوں کی طرح انسان باپوں کو بھی دوکان سے خرید سکتا ہے۔"

اس ٹرپ کے بعد میرا معمول بن گیا کہ جب کبھی مجھے برلین جانا ہوتا تھا، تو میں لوئیزے کو فون کر دیتا تھا اور وہ مجھے لینے کے لئے اسٹیشن پر پہنچ جاتی تھی۔ ہماری پہلی ملاقات کے وقت سونیا کنڈر گارٹن میں جاتی تھی۔ پھر اسے پری اسکول میں داخل کرایا گیا اور سات سال کی عمر میں وہ اسکول جانے لگی۔ لوئیزے اپنی بیٹی پر، جس کی باتوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، بے حد فخر مند تھی۔ سونیا کی استانی کا کہنا تھا کہ وہ اپنی طبعی عمر سے دو تین برس آگے تھی۔

اس دوران میں لوئیزے کی ماں مر گئی اور سونیا کی پرورش، دیکھ بھال اور دو جنوں کے لئے روزی کمانے کی ذمہ داری اکیلی لوئیزے کے سر پر آن پڑی۔ البتہ اس کو ایک ہسپتال میں مستقل ملازمت مل گئی تھی، جہاں اس کی درخواست پر اسے نائٹ شفٹ پر لگا دیا گیا تھا۔ صبح کے وقت ڈیوٹی سے واپسی پر اسے سونیا کو بیدار کرانا، نہلانا دھلانا اور ناشتہ کرا کے اسکول بھیجنا ہوتا تھا۔ بیٹی کے گھر سے جانے کے بعد وہ سو جاتی تھی اور اس کی اسکول سے واپسی تک اٹھ کر کھانا تیار کر دیتی تھی۔ اس کے بعد شام تک ماں بیٹی کا ساتھ ہوتا تھا، جو آہستہ آہستہ اس کی سہیلی کا روپ دہارتی جا رہی تھی۔ لوئیزے کے ڈیوٹی پر جانے تک سونیا سو چکی ہوتی تھی۔ ایک ہمسایہ فیملی کے پاس ان کے فلیٹ کی چابی موجود تھی اور وہ لوگ سونے سے پہلے سونیا کے کمرے میں جھانک کر اطمینان کر لیتے تھے کہ سب ٹھیک ہے۔ دو تین برسوں تک یہ انتظام چلتا رہا اور کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔

پھر ایک روز میں نے ٹیلی ویژن پر خبروں میں سنا کہ برلین میں رہنے والی نو برس کی سونیا گم ہو گئی ہے۔ وہ اپنے گھر سے صرف تین سو میٹر کے فاصلے پر واقع ایک دوکان پر کاپی خریدنے کے لئے گئی تھی اور واپس نہیں لوٹی تھی۔ اس کی بائیسکل سڑک کے کنارے اگی ہوئی جھاڑیوں میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی تھی، کیونکہ بائیسکل کا پچھلا مڈگارڈ اور پہیہ شکستہ حالت میں تھے۔ پولیس کا خیال تھا کہ حادثہ کسی کار کے ساتھ پیش آیا تھا اور ہوسکتا ہے کہ کار کا ڈرائیور سونیا کو ہسپتال میں پہنچانے کے لئے کار میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ مگر شام تک شہر اور گرد و نواح کے کسی

ہسپتال میں اسے داخل نہیں کرایا گیا تھا۔ اس خبر کے ساتھ نشر کی جانے والی تصویر کو دیکھ کر میں پہچان گیا کہ وہ لوئیزے کی بیٹی تھی۔

میں نے فوراً لوئیزے کے گھر پر فون کیا۔ مگر اس سے بات نہ ہوسکی۔ وہاں پر پولیس کا کوئی کارندہ بول رہا تھا۔ اس نے سونیا کی گمشدگی کی تصدیق کی اور کہا کہ اس سے زیادہ بتانے کی اسے اجازت نہیں ہے۔ میں نے بہتیرا کہا کہ میں سونیا کی ماں لوئیزے کا دوست ہوں اور اس سے بات کرنی چاہتا ہوں، مگر مجھے اس کی اجازت نہ ملی۔

اگلے دو ہفتوں کے دوران ہر روز اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سونیا کی لاحاصل تلاش کے بارے میں تفصیلات بتائی جاتی رہیں اور بار بار لوئیزے کی طرف سے سونیا کو اغوا کرنے والے کے نام اپیل نشر کی جاتی رہی کہ اس کی بیٹی کو آزاد کر دے۔ ابتداء میں گمان کیا جاتا تھا کہ شاید اغوا کرنے والے نے غلط فہمی کی بنا پر سونیا کو کسی امیر آدمی کی بیٹی سمجھ کر اچک لیا تھا۔ مگر جب اغوا کنندہ کی طرف سے کوئی مطالبہ نہ ہوا، تو سب کو یقین آ گیا کہ معاملہ دراصل مختلف تھا۔ جرمن معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو چھوٹی عمر کی بچیوں کو اپنی جنسی تسکین کا شکار بنانے کے لئے اغوا کرتے ہیں۔ اور اسی پر بس نہیں کرتے، بلکہ عموماً ان کو اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے مار ڈالتے ہیں۔

دو ہفتوں کے بعد برلین کے مضافاتی جنگل میں ایک بچی کی لاش ملی، جس کے بارے میں تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ وہ فی الواقعہ سونیا کی تھی۔ طبی تفتیش سے ثابت ہو گیا کہ اس کو جنسی تسکین کی خاطر قتل کیا گیا تھا۔ تھوڑے دنوں کے اندر اندر مجرم کو گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس کے ریکارڈ میں مجرم کا DNA محفوظ تھا، جس کی بنا پر اس کا سراغ لگانا آسان ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ سونیا کی سائیکل کے مڈگارڈ پر کار سے ٹکرانے کی وجہ سے کار کا رنگ لگ گیا تھا۔ مجرم نے اس دوران میں اپنی کار کی مرمت کرا لی تھی اور نیا روغن چڑھا لیا تھا۔ مگر پولیس کے ماہرین کے لئے یہ ثابت کرنا کچھ ایسا مشکل نہ تھا کہ سائیکل سے ٹکرانے والی کار وہی تھی۔ چنانچہ مجرم کے لئے اقبال جرم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

جب میں نے دوسری بار لوئیزے سے رابطہ کرنا چاہا، تو پتہ چلا کہ اس نے نقل مکانی کر لی تھی۔ اس دوران میں اس نے نہ صرف اپنا فون نمبر بدل لیا تھا، بلکہ متعلقہ محکمے کی اجازت سے نیا نام اختیار کر لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس نے یہ سب کچھ صحافیوں سے بچنے کی خاطر کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اخباروں میں اس کے انٹرویو چھپیں اور ٹیلی ویژن پر اس کی تصویر دکھائی جائے۔ میرے لئے اب اس

کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ملزم پر چلائے جانے والے مقدمے کی تاریخ کا انتظار کروں۔ مجھے امید تھی کہ لوئیزے سے عدالت میں ملاقات ہو سکے گی۔ چنانچہ میں خاص طور پر اس موقعہ پر برلین گیا۔ مگر وہاں پر مقدمے کی کاروائی کو دیکھنے کے شائقین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ لاٹری کے ذریعہ ان لوگوں کا انتخاب کرنا پڑا، جو عدالت میں جگہ پا سکتے تھے۔ اتفاق سے مجھے داخلے کا ٹکٹ مل گیا۔ مگر اندر جانے پر پتہ چلا کہ لوئیزے عدالت میں موجود نہ تھی۔ ملزم پر مقدمہ حکومت کی طرف سے دائر کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اگر لوئیزے چاہتی، تو مقدمے میں مدعی استغاثہ ثانی بن سکتی تھی۔ مگر اس نے اپنے اس حق کو استعمال کرنے سے صرف نظر کیا تھا۔ چونکہ ملزم اقبال جرم کر چکا تھا، اس لئے لوئیزے کو عدالت میں بلانا ضروری نہ سمجھا گیا تھا۔ بلکہ ملزم کے وکیل نے بھی اس کو عدالت میں گواہی کے لئے بلانے کے حق سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اس طرح لوئیزے سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ مقدمے کی اگلی کاروائی کا حال البتہ میں اخباروں میں پڑھتا رہا۔

ملزم پاؤل کے وکیل نے عدالت کو بتایا کہ اس کے مؤکل کی زندگی شروع سے بے حد قابل رحم حالات میں گذری تھی۔ یہاں تک کہ اس کے باپ نے اس کو اپنا بیٹا ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی ماں کا کریکٹر اچھا نہ تھا اور وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ ملزم اس کے بے شمار یاروں میں سے کس کے حمل سے پیدا ہوا تھا۔ وہ بیٹے کو اپنی برباد زندگی کا سبب قرار دیتی تھی اور اس کو دن رات کوستی رہتی تھی اور بات بات پر مارتی تھی۔ ملزم کا باپ اس سے بھی دو قدم آگے تھا۔ وہ نہ صرف اس کو مارتا تھا، بلکہ ابھی وہ چھوٹا بچہ ہی تھا کہ اس کو باپ کی مجرمانہ جنسی خواہشات پوری کرنی پڑتی تھیں۔ ماں باپ کو اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ وہ اسکول میں جائے اور کچھ سیکھے یا لکھے پڑھے۔ ملزم نے چھوٹی عمر میں ہی چوری چکاری شروع کر دی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ اگر وہ باپ کو چوری شدہ سیگریٹ لا کر دیتا تھا، تو ایک دو روز کے لئے اس پر تشدد رک جاتا تھا۔ وہ ٹوئیلٹی اسٹوروں سے ماں کے لئے نائیلون اسٹاکنگ چرا کر لاتا تھا اور اس کام کے لئے ماں سے اس کو شاباش ملتی تھی۔ چونکہ اس کو ماں باپ کی طرف سے جیب خرچ بہت کم ملتا تھا، اس لئے اس نے پیسے کمانے کے لئے دس بارہ سال کی عمر میں ہی اپنے جسم کو بیچنا شروع کر دیا تھا۔ نوجوانی میں قدم رکھتے رکھتے اس کی شخصیت اس قدر مسخ ہو چکی تھی کہ وہ اچھے اور برے کاموں میں امتیاز کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ شراب خوری اور نشہ آور اشیاء کے استعمال کے سبب اس کی سوچنے اور سمجھنے کی قوت کمزور پڑ گئی تھی۔ اس سے سرزد ہونے والے جرائم کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ خود بھی نہیں بتا سکتا کہ

اس کو کتنی بار قید و بند کی سزا ملی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے بیشتر برس قید خانوں میں بسر کئے تھے۔ وکیل نے عدالت سے اپیل کی کہ اس کے مدعی کو مریض جانتے ہوئے اس کے ساتھ رعایت برتی جائے، کیونکہ ملزم کو اپنے اعمال اور کرتوں پر اختیار نہ تھا۔ وہ ایک روبوٹ کی طرح تھا، جس کی چابی پھیر دی گئی ہو۔ اسے خود پتہ نہ تھا کہ اس کے اندر کونسی قوت کارگر تھی، جو اپنی من مانی کرتی تھی۔ وہ شکاری نہیں خود شکار تھا۔ اس لئے اس کو قید خانے میں بند کرنے کی بجائے کسی کلینک میں داخل کیا جانا چاہیئے، جہاں پر اس کے مرض کے علاج کا اہتمام ہو سکے۔

سرکاری وکیل کی بھی یہی رائے تھی۔ البتہ وہ چاہتا تھا کہ ملزم کو قید کی سزا بھگتنے کے بعد آزاد کرنے کی بجائے ایک ایسے کلینک میں رکھا جائے، جہاں پر کڑی نگرانی اور علاج کا انتظام موجود ہو اور اسے کسی صورت میں بھی کھلے بندوں معاشرے میں زندگی بسر کرنے کی رعایت نہ دی جائے۔ کیونکہ اس بات کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی کہ وہ آئندہ ایسے گھناؤنے اجرام کا ارتکاب نہیں کرے گا۔

عدالت نے ملزم کو اس کے اقبال جرم کے سبب اور عدالت کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے کی وجہ سے اس قابل جانا کہ اس کے ساتھ نرمی برتی جائے۔ چنانچہ اس کو آٹھ سال قید کی سزا دی گئی، جس کے دوران اس کا نفسیاتی علاج کیا جائے گا۔ اس امر کا فیصلہ ماہرین کی طرف سے ملنے والی رپورٹ پر منحصر ہو گا کہ اسے قید کی معیاد پورا ہونے سے پہلے آزاد کر دیا جائے یا نہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ عدالت کا فیصلہ منگل کے روز شام کی خبروں میں نشر ہوا تھا اور میں نے اس کے بارے میں بیڈمنٹن کھیلنے کے لئے کلب جاتے ہوئے راستے میں ریڈیو پر سنا تھا۔ ایک نامور صحافی نے اس پر کمنٹری کی تھی اور عدالت کو ایسا عقلمندانہ فیصلہ کرنے پر مبارک باد دی تھی اور کہا تھا کہ ہمارے مارڈرن زمانے میں عدالتوں کو ایسے فیصلوں سے اجتناب کرنا چاہیئے، جن سے بدلہ لینے کی بو آتی ہو۔ کیونکہ ایسے اجرام کا ارتکاب کرنے والے دراصل خود نہیں جانتے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ان کو اپنے افعال پر قابو نہیں ہوتا۔ اس لئے ان پر ترس کھانا چاہیئے۔

جب میں نے کلب میں اپنے کھلاڑی ساتھیوں سے اس بات کا ذکر کیا، تو ہیلموٹ نے کہا کہ اس کا بس چلے، تو ایسے مجرموں کو خصی کرا دے اور سب کو ایک اندھیرے کمرے میں بند کر کے اس پر مہر لگا دے۔ دوسرے کھلاڑی اس بات کو لے اڑے اور ہیلموٹ کا مذاق اڑانے لگے۔ کسی نے کہا کہ وہ اپنے وقت سے بہت بعد میں پیدا ہوا تھا۔ تھوڑا پہلے آ جاتا، تو یقیناً گاؤلائٹر بن جاتا اور فیوہرر کے ہاتھ سے

انعام واکرام پاتا۔ ہربرٹ کا کہنا تھا کہ لڑکیاں خود مردوں کو اکساتی پھرتی ہیں۔ان کی ذمہ داری کی بات کوئی نہیں کرتا۔کلب کی کھلاڑی لڑکیوں نے یہ بات سنی ،تو وہ ہربرٹ پر چڑھ دوڑیں۔ بچارے کو اپنی جان بچانی مشکل ہوگئی۔

پاؤل کو قید کی سزا آٹھ سال کی ملی تھی ،مگر چار برسوں کے بعد اس کو قید کی معیاد کے پورا ہونے سے پہلے آزاد کر دینے کا چرچا اخباروں میں ہونے لگا۔اس کے معالج نے اس کے بارے میں یہ رائے دی تھی کہ پاؤل سے کسی ایسے فعل کا امکان نہیں رہا۔علاوہ اس بات کے کہ اس نے طبیب کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا تھا، یہ بات بھی اس کو وقت سے پہلے آزاد کرنے کے حق میں جاتی تھی کہ پاؤل کو اس عرصے میں ایک برسرروزگار عورت کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کرنے میں کامیابی ہوئی تھی، جو اس کو اپنے گھر میں رہائش کے لئے جگہ دینے کو تیار تھی۔ چنانچہ نہایت خاموشی کے ساتھ پاؤل کو عدالت کی رضامندی سے جیل خانے سے آزاد کر دیا گیا۔اس کی دوست عورت اس کو اپنی کار میں لینے کے لئے آئی تھی۔اس بات کا علم صحافیوں کو پاؤل کے جانے کے بعد ہوا۔جیل کا کرتا دھرتا ان کو اس کا نیا ایڈریس دینے کے لئے تیار نہ تھا۔

اس سے اگلے روز پاؤل کے مرنے کی خبر آ گئی۔ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا کہ اس کی دوست عورت کو قتل کے الزام کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا۔صحافیوں کو اس امر کا سراغ لگانے میں کامیابی ہوئی تھی کہ پاؤل کی دوست عورت نے اس کو شراب اور دوسری نشہ آور اشیاء دینے کے بعد اس کی مدہوشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا عضو تناسل استرے سے کاٹ دیا تھا۔اس کے بعد وہ کمرے کو باہر سے تالا لگا کر گھر سے باہر چلی گئی تھی۔اگر پاؤل کو وقت پر طبی امداد مل جاتی ،تو اس کو بچایا جا سکتا تھا۔مگر بے رحم عورت نے اپنے فلیٹ کا فون کاٹ ڈالا تھا اور پاؤل مدہوشی کے عالم میں ہی جسم کا سارا خون بہہ جانے کے سبب جان توڑ گیا۔اس روز اخبار کی سرخی یہ تھی:"ایک مدہوش انسان کا بے رحم انجام"۔

شام پڑنے تک صحافیوں نے اس عورت کا اتا پتا لگا لیا تھا۔وہ اس لڑکی کی ماں تھی، جس کو پاؤل نے اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ پتہ چلا کہ لوئیزے نے اپنے وحشیانہ انتقام کا ارادہ اس روز باندھ لیا تھا، جب اس کی بیٹی کی لاش جنگل میں ملی تھی۔اسی وجہ سے اس نے اپنی تصویر اخباروں میں نہ چھپنے دی تھی اور پاؤل پر چلائے جانے والے مقدمے کی کاروائی کے دوران عدالت میں بھی حاضر نہ ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ پاؤل اس کی شکل دیکھ کر جان جائے کہ وہ سونیا کی ماں ہے۔اسے پاؤل کے ساتھ

دوستی لگانے اور اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی تھی۔ پاؤل کے قید کی معیاد کے پورا ہونے سے پہلے آزاد کئے جانے میں بھی لوئیزے کا ہاتھ تھا۔ اور جب وہ اس کو اپنے گھر لے جانے کے لئے آئی، تو وہ اس پر اعتبار کرتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اس کی بے خبری سے لوئیزے اس بے دردی سے فائدہ اٹھائے گی۔ جب مقدمہ عدالت کے سامنے آیا، تو یہی بات لوئیزے کے خلاف پیش کی گئی۔ جس کی سنگینی کی بنا پر اس کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ لوئیزے برلین کے قید خانے میں اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن گذار رہی ہے۔

جب مجھے لمبے وقفے کے بعد پچھلے دنوں برلین سے ایک تقریب میں شامل ہونے کی دعوت ملی، تو میں نے اپنے دوسرے سارے ضروری اور غیر ضروری کاموں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اسے قبول کر لیا، کیونکہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہاں پر لوئیزے سے ملنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔

(کمر فیلڈ۔ ۴ ستمبر ۲۰۰۲ء)

خودغرض عورت

گوہلکے کو میں ستائیس برسوں کے بعد مل رہا تھا اور وہ بھی ٹانٹے ایرینا کی سالگرہ کی پارٹی میں، جو اس سال ایک کیفے میں منائی جارہی تھی۔ پہلے برسوں میں ٹانٹے ایرینا ہر سال اپنے گھر پر پارٹی دیتی تھی، جس میں وہ اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ مجھے بلانا کبھی نہ بھولتی تھی۔ پارٹی کے لئے وہ ہمیشہ چار پانچ مختلف قسموں کے کیک بناتی تھی، جن کی تیاری دو تین روز پہلے سے شروع ہوجاتی تھی۔ مہمانوں کے پہنچنے پر باورچی خانے میں کافی اور چائے تیار کرنے کے لئے پانی کی کیتلی چولہے پر چڑھ جاتی تھی اور ساری شام پانی ابلتا رہتا تھا۔ سب کو پتہ تھا کہ ٹانٹے ایرینا کی پارٹی میں شراب نہیں چلتی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ جسے شراب پینے کا شوق ہے، وہ پب میں چلا جائے اور واپس لوٹنے کی بجائے وہیں سے اپنے گھر کا رخ کرے۔ جرمن معاشرے میں شراب کے بغیر سالگرہ کی پارٹی کو کامیاب تصور نہیں کیا جاتا۔ مگر ٹانٹے ایرینا کے اس اصول کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی تھی۔ اس کے باوجود ٹانٹے ایرینا کی پارٹی میں شامل ہونے کو خاندان کے سب افراد ایک انعام سمجھتے تھے اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی فرد نے کبھی ناغہ کیا ہو۔ پھر جب ٹانٹے ایرینا کی عمر اسی برس کی ہوگئی، تو اس نے کہہ دیا کہ بس بہت ہوگیا۔ یہ آخری بار ہے، اگلے برس سے میں سالگرہ کی پارٹی نہیں دوں گی۔ اس کی بیٹی ہیلگا کو اس سے اتفاق نہ تھا، جو خاص طور پر اس پارٹی میں شمولیت کے لئے میونخ سے آئی تھی۔ اس نے کہا ہر سال تو میں فاصلے کی دوری کے سبب پارٹی نہیں دے سکتی، مگر پانچ برسوں میں، جب ماما پچاسی کی ہوجائے گی، تو سالگرہ کی پارٹی میری طرف دی جائے گی۔ میں نے کہا کہ جب ٹانٹے ایرینا نوے سال کی ہوجائے گی، تو سالگرہ کی پارٹی میری طرف سے ہوگی۔ گوہلکے نے کہا کہ جب وہ پچانوے کی ہوجائے گی، تو پارٹی وہ دے گا۔ اس پر ہم سب ہنس دیئے۔ ٹانٹے ایرینا نے گوہلکے سے کہا کہ جب میں پچانوے کی ہوجاؤں گی، تو تم سو سال کے ہوگے۔ کون جانتا ہے کہ میں پچانوے برسوں تک جیوں گی بھی یا نہیں۔ اور اگر میں جیوں گی، تو تم خدا جانے

اس وقت جہنم کے کس طبقے میں جل بل رہے ہوگے۔ میں اتنے برسوں تک زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ یوں بھی دنیا اب اس قابل نہیں رہی کہ انسان مزید جیئے۔

یہ پہلی بار تھی کہ میں ٹانٹے ایرنا کے منہ سے ایسی مایوسی کی بات سن رہا تھا۔ وگرنہ وہ بنیادی طور پر رجائیت پسند تھی۔ میں اسے اس وقت سے جانتا تھا، جب اس کی بہن سیگریڈ نے، جس کے پاس میں اس زمانے میں رہائش پذیر تھا، اپنی بڑی بہن کی جوبلی کا جشن منایا تھا اور مجھے تاکید سے اس میں شامل ہونے کو کہا تھا۔ مجھے اس زمانے میں پتہ نہ تھا کہ آگے چل کر ٹانٹے ایرنا میرے لئے جرمنی میں خاندان کا بدل بن جائے گی۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اسے ٹانٹے (خالہ) کہنا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ بعد میں جب میری شادی ہوئی، تو ٹانٹے ایرنا نکاح کے گواہ کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئی تھی۔ اس دن سے اوتانے بھی اسے اپنے خاندان کی بزرگ مان لیا تھا۔

ٹانٹے ایرنا اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی اور قد کاٹھ میں بھی دوسروں سے ممتاز تھی۔ اس جیسی شرافت کی پتلی اور ہر قسم کے ہیر پھیر سے پاک عورت میں نے ساری عمر میں کہیں نہیں دیکھی۔ جب مجھے سیگریڈ اور ہربرٹ کے ہاں رہتے ہوئے تین ماہ ہو چلے تھے اور میں گرمیوں کی چھٹیوں میں انگلستان جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک انکے بیٹے والٹر نے لکھا کہ وہ ہمبرگ واپس لوٹ رہا ہے۔ میں اس کے ماں باپ کے مکان پر اس کے کمرے میں رہتا تھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ مجھے اس نئی صورت حال سے آگاہ کیا جاتا، سیگریڈ نے اس بارے میں اپنی بہن ایرنا سے بات کی اور دونوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ آپس میں طے کر لیا کہ والٹر کی واپسی پر مجھے ٹانٹے ایرنا کے ہاں کمرہ مل جائے گا۔

چنانچہ میری ہمبرگ سے غیر حاضری کے دوران میرا سامان ٹانٹے ایرنا کے گھر پہنچا دیا گیا۔ مجھے پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ انگلستان کے سفر سے واپسی پر مجھے سیدھا وہیں پر جانا ہوگا۔ پورے ایک مہینے کا کرایہ مجھے نہ سیگریڈ کے ہاں ادا کرنا پڑا اور نہ ٹانٹے ایرنا نے لینا پسند کیا۔ میں نے اس وقت تک ٹانٹے ایرنا کو بس دو تین بار دیکھا تھا، جب وہ اتوار کا دن اپنی بہن اور بہنوئی کے ہاں گذارنے کے لئے آئی تھی اور جب سیگریڈ نے اس کا جشن منایا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ بہت خاموش طبع اور انصاف پسند عورت تھی۔ اس کی ہر بات ناپی تولی ہوتی تھی۔ مجھے اپنے ہاں کمرہ دینے کا فیصلہ خدا جانے اس نے مجھ میں کیا دیکھ کر کر لیا تھا۔ اس بات کا علم مجھے بعد میں جا کر ہوا کہ اسے اپنے فلیٹ میں کرایہ دار رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ البتہ اس کا ذاتی مہمان وہاں پر تین ماہ تک قیام کر سکتا تھا۔ یوں بھی اس کا فلیٹ صرف تین کمروں

پر مشتمل تھا اور جس کمرے میں مجھے رکھا جانا تھا، وہ اس کی بیٹی ہیلگا کا تھا، جو اس زمانے میں پیرس میں پڑھتی تھی اور گاہے بگاہے ماں کو ملنے کے لئے ہمبرگ آیا کرتی تھی۔ گویا وہ کمرہ مجھے محض اس لئے دیا جا رہا تھا کہ ٹانٹے ایرنا کو میری امداد کرنا مقصود تھا۔ اسے یہ احساس تھا کہ میں انگلستان کے سفر پر جانے سے پہلے اتنے تھوڑے نوٹس پر کہاں کمرہ تلاش کرتا پھروں گا۔ البتہ وہاں سے واپسی پر اس کام کے لئے میرے پاس تین ماہ کا عرصہ ہوگا۔

میں انگلستان کے سفر سے واپس لوٹا، تو مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ ٹانٹے ایرنا کے ہاں میرا کمرہ کیسا ہو گا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ مجھے کبھی اس محلے میں بھی جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا، جہاں پر ٹانٹے ایرنا رہتی تھی۔ بہرصورت میں پوچھتا پاچھتا وہاں پر پہنچ ہی گیا۔ اس کا فلیٹ ایک تین منزلہ سرخ بلڈنگ میں تھا۔ آس پاس ویسی ہی عمارتیں کھڑی تھیں۔ وہ جگہ سٹی ٹرین کے اسٹیشن سے چھ سات سو میٹر کے فاصلے پر تھی، جہاں سے ہر پانچ منٹ کے بعد ریل گاڑی شہر کے مین اسٹیشن کے لئے ملتی تھی، جو وہاں سے صرف تین اسٹیشن دور تھا۔ چونکہ یونیورسٹی شہر کے مرکز میں تھی، اس لئے مجھے یونیورسٹی آنے جانے کی آسانی ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ ٹانٹے ایرنا اس بات پر خوش تھی کہ اب اسے اکیلے ناشتہ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ تو میرے لئے شام کا کھانا بھی پکانے کے لئے تیار تھی، مگر میں شام کو یونیورسٹی کے مینزا میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھانے کو ترجیح دیتا تھا۔ بلکہ اب میرے لئے یہ ممکن بن گیا تھا کہ شام کے وقت تھیٹر میں جا سکوں، جس کے لئے طالب علموں کو ٹکٹ سستے داموں، بلکہ اکثر مفت میں ملتے تھے۔ میں ان دنوں جرمن زبان کا امتحان پاس کرنے کے بعد باقاعدہ طور پر اپنے تعلیمی کورس کا آغاز کر رہا تھا۔

ٹانٹے ایرنا کے ہاں گذرنے والے تین ماہ بہت خاموشی اور اطمینان سے بسر ہوئے۔ میں نے کبھی اسے شکایت کا موقعہ نہ دیا۔ مجھے اس کے اصولوں کا پتہ تھا، جن میں سے پہلے نمبر پر یہ تھا کہ کوئی لڑکی میرے پاس شب بسری کے لئے نہیں آئے گی۔ دن کے وقت گھڑی کی گھڑی ملنے کے لئے کوئی آنا چاہے، تو اس پر پابندی نہ تھی۔ اتوار کے روز دوپہر کا کھانا ہم اکٹھے کھاتے تھے، کیونکہ اس روز یونیورسٹی کا کیفے ٹریا بند ہوتا تھا۔ کھانے پینے کا سامان ٹانٹے ایرنا خرید کر لاتی تھی اور مجھ سے صرف ان چیزوں کے پیسے لیتی تھی، جو میرے استعمال میں آتی تھیں۔ اس نے ازخود میرے کپڑے بھی دھونے شروع کر دیئے۔ اس طرف سے بےفکر ہو کر میں سارا وقت اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے لئے صرف کر سکتا تھا۔ مجھے یہ لگتا تھا، جیسے میں اپنی ماں کے پاس رہ رہا ہوں، جسے اس زمانے میں مرے ہوئے ایک دہائی ہو چکی تھی۔

ٹانٹے ایرینا مجھے اپنے بیٹے کی طرح چاہتی تھی، جس کی اس کے دل میں ہمیشہ خواہش رہی تھی۔

تین ماہ کے خاتمے سے پہلے مجھے دوسرا کمرہ تلاش کرنا تھا۔ میں نے دو تین اسٹوڈنٹ ہوسٹلوں میں درخواست دے رکھی تھی، مگر کسی طرف سے حوصلہ افزا جواب نہیں مل رہا تھا۔ ٹانٹے ایرینا کو اس بات کا پتہ چلا، تو اس نے اپنے طور پر اپنی سالی مائیکے کے ہاں میرے لئے کمرے کی بات کر لی۔ وہ لوگ مجھے نہیں جانتے تھے، اس لئے مجھے ایک اتوار کی سہ پہر کو مائیکے کے خاوند گوہلکے کے حضور انٹرویو کے لئے حاضر ہونے کو کہا گیا۔ ٹانٹے ایرینا نے چلتے ہوئے مجھے کہا کہ گوہلکے ذرا اکھڑ آدمی ہے اور پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کی بات کو رد کرے۔ حتیٰ کہ اس کی بیوی کو بھی اسکے سامنے جھک کر رہنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اسے گوہلکے بالکل پسند نہیں ہے، مگر آدمی کچھ ایسا برا بھی نہیں۔ شاید وہ یہ چاہتی تھی کہ میں گوہلکے کے سامنے کسی قسم کی شوخی کا اظہار نہ کروں، جسکے نتیجے میں وہ مجھے کمرہ دینے سے انکار کر سکتا ہے۔

میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچا۔ گوہلکے کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ وہ ادھیڑ عمر کی عورت تھی، جو جوانی کے زمانے میں بہت خوبصورت رہی ہوگی۔ اس کے نقش ونگار بے حد دلکش تھے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر تناؤ کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے ڈرائینگ روم میں لے جایا گیا، جہاں پر گوہلکے ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر میرے ساتھ مصافحہ کیا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے کمرے کے عین درمیان رکھے ہوئے ایک میز کی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میز پر تین پیالیاں پڑی تھیں اور گوگل ہوف کیک رکھا ہوا تھا۔ اس کی بیوی اس دوران میں کافی کی چینک لانے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ میں اس کی بتائی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو اس کے سوالات کا جواب دینے کے لئے تیار کرنے لگا۔ اسے یقیناً ٹانٹے ایرینا نے میرے بارے میں بتا دیا ہوگا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں اور کب سے جرمنی میں ہوں اور کیا پڑھتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر میرے بارے میں بھلا جاننے کو کیا رکھا تھا؟

گوہلکے نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب دکھاتے ہوئے بتایا کہ وہ کارل مائی کی تصنیف ہے اور کردستان کے بارے میں ہے۔ پھر اس نے کتابوں کی الماری کی طرف اشارہ کیا، جس میں ایک جیسی مجلد کتابوں کی چالیس پچاس جلدیں رکھی تھیں۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس کارل مائی کی کتابوں کا مکمل سیٹ موجود ہے، جس کو اس نے بچپن میں پہلی بار پڑھا تھا اور اب چوتھی بار پڑھ رہا ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ پیشے کے اعتبار سے بیکر ماسٹر اور کچھ ایسا زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ شاید وہ مجھے یہ جتانا چاہتا تھا

کہ میں اسے ان پڑھ مزدور نہ جانوں۔ وہ قاری ہے، جو کارل مائی کی ساری کتابیں پڑھ چکا ہے۔

کارل مائی نے انیسویں صدی میں مشرق وسطی کے ملکوں اور امریکہ کے ریڈ انڈین کے بارے میں ایڈونچرس ناول لکھے تھے، جو جرمنوں کے ہاں بے حد مقبول ہیں۔ جس زمانے میں اس نے یہ کتابیں لکھیں، وہ دھوکہ بازی کے جرم کے تحت جیل خانے میں قید کی سزا کاٹ رہا تھا۔ اس نے اس وقت تک جرمنی کی سرحدوں سے باہر قدم نہ دھرا تھا۔ جو کچھ تھوڑا بہت وہ ان ملکوں کے بارے میں جانتا تھا، وہ دوسروں کی کتابوں سے ماخوذ تھا۔ بلکہ بیشتر چیزیں اس کے اپنے دماغ کی ایجاد تھیں۔ جرمنوں کے اندر عربوں، کردوں، ترکوں اور امریکہ کے ریڈ انڈین کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں اسی کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ آج تک اس کی کتابیں ہر جرمن طالب علم بچپن میں پڑھتا ہے اور ساری عمر ان کے زیر اثر رہتا ہے۔ کارل مائی جرمن زبان کا سب سے بڑا بیسٹ سیلر مصنف ہے، جس کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر جرمن گھروں کی زینت بنتی ہیں اور نسل در نسل جرمن قوم کے ذہنوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مگر یہ باتیں اس زمانے میں ابھی میرے علم میں نہ آئی تھیں۔ میں نے اس کی کتابوں کی بنا پر بنائی جانے والی چند فلمیں دیکھی تھیں، جو ریڈ انڈین کے بارے میں تھیں۔ چونکہ میں ابھی ہالی ووڈ کی فلم انڈسٹری پر پوری طرح ایمان نہیں لایا تھا، اس لئے کارل مائی مجھے ریڈ انڈین کے بارے میں زیادہ مستند لگتا تھا۔ اس کی کہانیوں میں ریڈ انڈین اپنی بات کے پکے، بہادر اور نڈر ہوتے تھے، جو سفید چمڑی والوں کے سامنے جھکنے کے لئے تیار نہ تھے۔ چونکہ وہ لوگ ہیر پھیر نہیں جانتے تھے، اس لئے ان کو دھوکہ دے کر مارا جاتا تھا۔ کہانی کے قاری کے دل میں ان کے لئے عزت اور محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے جرمن بچے عام طور سے جنگی کھیلوں میں بہادری کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنے لئے ریڈ انڈین نام اختیار کرتے ہیں، جو عام طور سے کارل مائی کی کتابوں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں جرمن بچے کرسمس یا برتھ ڈے پر ماں باپ سے تحفے میں ریڈ انڈین لباس، جن میں پرندوں کے رنگ برنگے پر لگتے ہیں، اور ان کے جنگی ہتھیار دیئے جانے کی فرمائش کرتے تھے۔

پتہ نہیں کیسے ہماری گفتگو کا رخ کارل مائی کی کتابوں سے ہٹ کر دوسری عالمگیر جنگ کی طرف مڑ گیا، جس کو ختم ہوئے سولہ سال ہو چکے تھے، مگر جس کے اثرات جرمن معاشرے میں قدم قدم پر ملتے تھے۔ گوہلکے نے کہا کہ وہ پہلے دن سے آخری دن تک جنگ کے محاذ پر پہلی صف میں لڑا تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ اس کی بندوق سے کوئی انسان نہیں مارا گیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس طرح ممکن تھا؟ اس

نے جواب دیا کہ وہ ہمیشہ ہوا میں گولیاں چلاتا رہا تھا۔ یہ درست ہے کہ بندوق کا رخ دشمن کے مورچوں کی طرف ہوتا تھا، مگر اس کی چلائی ہوئی گولیاں دشمن فوجیوں کے سروں کے اوپر سے گذر جاتی تھیں۔ میں نے کہا کہ شاید اسی وجہ سے جرمن فوج کو اسٹالن گراڈ میں منہ کی کھانی پڑی تھی۔ گوہلکے میری طنز کو خاموشی سے پی گیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کی بات بودی تھی اور مجھے پتہ تھا کہ جنگ کے محاذ پر انسان اپنی جان بچانے کے لئے سب کچھ کر گذرتا ہے۔ اگر وہ دشمن کو نہیں مارتا، تو خود مارا جاتا ہے۔ اور کون اس طرح مرنا چاہتا ہے۔

گوہلکے جنگ کے خاتمے پر پانچ برسوں تک روسی جنگی قید میں رہا تھا، جس کے دوران اسے سائبیریا کے علاقے میں کوئلے کی کانوں میں کام کرنا پڑا تھا، جن کی سرنگیں اتنی تنگ ہوتی تھیں کہ انہیں ان میں گھٹنوں کے بل رینگنا پڑتا تھا۔ اس نے اپنے گھٹنے پر سے، جس پر دائمی سوجن رہتی تھی، پتلون کو اوپر اٹھا کر دکھایا کہ کوئلہ اس کی جلد میں دھنس گیا تھا۔ وہیں پر وہ گھنٹیا کی بیماری کا شکار بنا تھا۔ اس کے بدن کے جوڑوں میں مستقل درد رہتا تھا، بالخصوص جب موسم بدلتا تھا اور ہوا میں خنکی بڑھ جاتی تھی۔ ان کو اس سارے عرصے میں کبھی بیگار سے چھٹی نہ ملتی تھی۔ یہاں تک کہ بیماری کی حالت میں بھی ان کو کوئلے کی کان میں اترنا پڑتا تھا۔ ایک بار اس کی حالت بہت خراب تھی اور اسے سخت بخار چڑھا ہوا تھا۔ کیمپ کی لیڈی ڈاکٹر نے کہا کہ اسے دو روز کا ریسٹ ملنا چاہیئے، مگر بدقسمتی سے اس روز کے لئے بیماروں کا کوٹہ پورا ہو چکا تھا۔ ایک مقررہ تعداد سے زیادہ قیدیوں کو بیماری کی چھٹی نہیں دی جا سکتی تھی۔ گوہلکے نے کہا کہ ان کو کھانے کے لئے اتنا کم راشن ملتا تھا، کہ ایک بچہ بھی اس راشن پر زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اس وجہ سے بے شمار قیدی ہر روز مرتے تھے، جن کو بے پرواہی سے کسی گڑھے میں گاڑ دیا جاتا تھا۔ جب پانچ برسوں کے اس عذاب کے خاتمے پر اس کو جرمنی واپس بھیجا گیا، تو اس کا وزن بمشکل ایک تہائی رہ گیا تھا۔ اس کی بیوی اسے لینے کے لئے قیدیوں کے کیمپ میں آئی، تو اسے پہچان نہ سکی۔ وہ خود اس کی طرف لڑکھڑاتا ہوا گیا تھا اور جب اس نے مائیکے کا نام لے کر پکارا، تو وہ اسے دیکھ کر یوں آنکھیں پھاڑے ہوئے کھڑی رہ گئی تھی، جیسے وہ اپنے خاوند کو نہیں، کسی بھوت کے ہیولے کو دیکھ رہی ہو۔

گوہلکے اونچے قد کا آدمی تھا، جس کو گھنٹیا کی بیماری نے وقت سے پہلے نڈھال کر دیا تھا۔ ٹانٹے ایرنا نے مجھے بتایا تھا کہ گوہلکے اپنے کام کے سوا کسی چیز سے واسطہ نہیں رکھتا۔ اس کا کسی کے ہاں آنا جانا نہیں تھا۔ حتی کہ اس نے اپنی بیوی کو ٹانٹے ایرنا کے ہاں سال بھر میں ایک بار ہونے والی سالگرہ کی پارٹی

میں بھی شامل ہونے سے منع کر رکھا تھا۔ جب تک ٹانٹے ایرنا کا خاوند ایریش زندہ تھا، وہ اپنی بہن سے ملنے کے لئے ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ مگر گوہلکے کبھی ان کے گھر نہیں آتا تھا۔ اس کا بہانہ یہ تھا کہ اس کے بیکری میں کام کے اوقات ایسے بے ہودہ ہیں کہ وہ کہیں نہیں جا سکتا۔

گوہلکے نے کہا کہ اس کو پسند نہیں ہے کہ اس کے فلیٹ میں کسی قسم کا شور شرابا ہو۔ بالخصوص شام پڑنے کے بعد کوئی ملاقاتی وہاں پر نہیں آ سکتا، کیونکہ دروازے کی گھنٹی بجنے سے اس کی نیند میں خلل پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ یوں بھی اس زمانے میں جرمنی میں قانونی طور پر ذیلی کرائے داروں کو ملنے کے لئے آنے والے مہمان رات کے دس بجے تک ان کے پاس ٹھہر سکتے تھے۔ اگر کوئی مہمان دس بجنے کے بعد تک رک جاتا تھا، تو اس بنا پر ذیلی کرائے دار کو فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس دیا جا سکتا تھا۔ گوہلکے سر شام مرغیوں کی طرح دڑبے میں بند ہو کر سو جاتا تھا۔ اسے بہت سویرے کام پر جانا ہوتا تھا۔ بیکری میں کام رات کے اڑھائی تین بجے شروع ہوتا تھا، تاکہ لوگوں کے بیدار ہونے اور کام پر جانے سے پہلے ان کے ناشتے کے لئے بن، ڈبل روٹی اور جرمنی کی خاص گول روٹی، جس کو بروئٹ شن کہتے ہیں اور جو کسی تکڑے آدمی کی بند مٹھی کے برابر ہوتی ہے ، تازہ تازہ تیار ہو کر دوکانوں میں پہنچا دی جائیں۔

اس زمانے میں بیشتر گھروں میں ٹیلی ویژن سیٹ لگ چکے تھے۔ صرف گوہلکے کے ہاں اسکی آمد پر پابندی تھی۔ اسکی بیوی کو شام پڑنے کے بعد ریڈیو سننے کی بھی اجازت نہ تھی، کیونکہ گوہلکے کا کہنا تھا کہ ریڈیو کی برقی لہریں اس کی نیند میں حرج پیدا کرتی ہیں۔ مگر اس بات کا علم مجھے اس وقت جا کر ہوا، جب میں گوہلکے کی ساری شرائط کو قبول کرنے کے بعد اس کے فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ ہم سب جنوں کے نہانے کے لئے اتوار کا دن مقرر تھا۔ جب گوہلکے کی بیوی پانی کا حمام گرم کرتی تھی۔ فلیٹ میں سنٹرل ہیٹنگ نہیں تھی۔ البتہ سب کمروں میں کوئلے کے اوون رکھے ہوئے تھے ، جو بوقت ضرورت جلائے جاتے تھے۔ شام کو میرے یونیورسٹی سے گھر لوٹنے کے وقت سے آدھ پون گھنٹہ قبل گوہلکے کی بیوی میرے کمرے کے اوون میں کوئلہ ڈال کر اس میں آگ سلگا دیتی تھی۔ میری واپسی تک کمرہ اچھا خاصا گرم ہو جاتا تھا اور تین چار گھنٹوں تک گرم رہتا تھا۔ البتہ سونے کا وقت آنے تک وہ پھر سے ٹھنڈا ٹھار ہوتا تھا۔ اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے ٹھنڈے کمرے میں سونے کی عادت پڑ گئی۔ دوسری طرف راہداری اور باتھ روم میں اتنی ٹھنڈک ہوتی تھی کہ انسان کی روح تک کانپ جاتی تھی۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ گوہلکے نے ٹیلی فون لگوا رکھا تھا، جس کو میں بیس پینی فی لوکل کال ادا کر کے استعمال کر سکتا تھا۔ اس

مقصد کے لئے ایک ڈبہ ٹیلی فون کے پہلو میں رکھا ہوا تھا، جس میں مجھے مقررشدہ شرح کے حساب سے پیسے ڈالنے ہوتے تھے۔ پہلا مہینہ ختم ہوا، تو گو ہلکے نے ٹیلی فون کا بل آنے پر پیسے گنے اور مجھے بتایا کہ میں نے اپنی کالوں کے حساب سے بالکل درست پیسے ڈبے میں ڈالے تھے۔ پھر اس نے مجھے مشورہ دیا کہ خود لوگوں کو فون کرنے سے بہتر یہ ہے کہ دوسروں کو فون کرنے کو کہا جائے۔ اب میں اسے کیسے بتاتا کہ لڑکیوں سے ڈیٹ لینے کے لئے انسان کو کیسے کیسے پاپڑ بیلنے اور کتنے فون کرنے پڑتے ہیں۔

جب کبھی میں شام ڈھلے کوئی لیکچر سننے یا تھیٹر میں ڈرامہ یا سنیما میں فلم شو دیکھنے کے بعد گھر واپس لوٹتا تھا، تو گو ہلکے اپنے شب خوابی کے کمرے میں غائب ہو چکا ہوتا تھا۔ البتہ اس کی بیوی ڈرائینگ روم میں بیٹھی ہوئی سوئٹر، جرابیں یا کوئی دوسری اونی چیز بن رہی ہوتی تھی۔ چند ہفتوں کے اندر اندر میں نے دیکھا کہ وہ مکمل ہو جانے والی چیزیں ادھیڑ کر نئے سرے سے بننا شروع کر دیتی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی، تو اس نے کہا کہ ان چیزوں کی مانگ نہیں رہی۔ اس کے رشتہ داروں اور واقف کاروں میں کوئی شخص باقی نہیں بچا، جس کے لئے وہ کچھ بن سکے۔ یوں بھی سب لوگ مشین کی بنی ہوئی چیزیں پہننی پسند کرتے ہیں۔ چونکہ وہ ساری شام بیکار نہیں بیٹھ سکتی، اس لئے چیزیں بنتی، ادھیڑتی اور پھر بنتی رہتی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ شام کو ریڈیو سننا پسند کرے گی؟ اس نے شب خوابی کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میرا خاوند مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا۔ میرے پاس اس زمانے میں ایک منا سا ٹرانزسٹر ریڈیو تھا، جو لاؤڈ اسپیکر کے بغیر تھا اور صرف ائیرفون کو کان پر لگا کر سنا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس ریڈیو سے برقی لہریں نہیں نکلتیں، کیونکہ وہ بیٹری کے سیل اور بجلی کے بغیر چلتا ہے۔ ریڈیو پروگرام کو ریسیو کرنے کے لئے اتنا کافی تھا کہ اس کے اینٹنے کی تار کو کسی دھات کے لیمپ یا سنٹرل ہیٹنگ کے پائپ سے جوڑ دیا جائے۔ مکان میں سنٹرل ہیٹنگ تو نہیں تھی، مگر اتفاق سے ایک ایسا ٹیبل لیمپ اس کمرے میں موجود تھا اور اس کام آ سکتا تھا۔ چند منٹوں کے اندر اینٹنے کی تار کو ٹیبل لیمپ سے جوڑ دیا گیا اور ہمبرگ کے مقامی ریڈیو اسٹیشن کا پروگرام بالکل صاف سنائی دینے لگا۔ گو ہلکے کی بیوی کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر پھیل گئی۔ اگلی صبح اس نے بتایا کہ وہ آدھی رات تک ریڈیو سنتی رہی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ اب اس کی شامیں دلچسپ گذرا کریں گی۔

ہفتہ عشرہ کے بعد گو ہلکے کی نظر ٹیبل لیمپ سے جڑے ہوئے اینٹنے پر پڑی، تو وہ غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے پوچھے بھالے بغیر اینٹنے کی تار کو کھینچ کر الگ کر دیا اور اپنی بیوی کو برا بھلا

کہا، جس نے مجھے ایسا بیہودہ کام کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس نے بہتیرا کہا کہ میں نے یہ سب کچھ اس کی خاطر کیا تھا اور اب وہ شام کے وقت ریڈیو سن سکتی ہے۔ مگر گو ہلکے نے اس کی ایک نہ سنی۔ میں شام کو گھر لوٹا، تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ریڈیو سیٹ میرے کمرے کی میز پر دھرا تھا۔ میں نے گو ہلکے کی بیوی سے اس کی وجہ پوچھی، تو اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اس کا خاوند نہیں چاہتا کہ اینٹنے کی تار اس کے ٹیبل لیمپ کے ساتھ جوڑی جائے۔ میں نے کہا کہ میں خود اس کے خاوند سے اس بارے میں بات کروں گا۔ مگر اس نے گڑگڑا کر کہا کہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ میرے خاوند کی خدائی میں صرف اس کی بات چلتی ہے۔ کہیں وہ تمہیں کمرہ خالی کرنے کا نوٹس نہ دے دے۔

مجھے اس چیز نے بہت بے چین کیا اور میں نے اس بارے میں ٹانٹے ایرینا کی رائے جاننا چاہی۔ اس نے کہا کہ گو ہلکے کو اپنی بیوی کے جذبات اور اس کی خواہشات کا کوئی پاس نہیں ہے۔ وہ شروع سے ایسا روکھا اور غیر مہذب انسان تھا۔ مائیکے کا بھائی ایریش اپنی بہن کو یہ کہتا کہتا مر گیا کہ اس جنگلی آدمی میں ساری عمر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس سے طلاق لے لو۔ مگر مائیکے نے بھائی کی بات مان کر نہ دی۔ تم نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ تمہاری زبان میں اللہ میاں کی گائے کا محاورہ پایا جاتا ہے۔ مائیکے پر یہ محاورہ صادق آتا ہے۔ وہ ساری عمر دکھ سہتی رہی ہے، مگر کیا مجال ہے کہ اس نے کبھی اپنا منہ کھولا اور احتجاج کیا ہو۔ اس کا خاوند اس کی اتنی سی خوشی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ تم نے ریڈیو سیٹ کے ذریعہ اس پر باہر کی دنیا کی طرف ایک کھڑکی کھول دی تھی، جہاں پر موسیقی کے پروگرام، ڈرامے اور فیچر نشر ہوتے ہیں۔ شاید گو ہلکے کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں اس کی بیوی کے دل میں بغاوت کے جراثیم نہ پیدا ہو جائیں۔ میں اگر مائیکے کی جگہ پر ہوتی، تو کبھی کی اس اکھڑ انسان کو وہاں پر بھیج چکی ہوتی، جہاں پر فلفل اگتا ہے اور جہاں پر ہوٹن ٹوٹن جنگلیوں کا قبیلہ بستا ہے۔

اس روز میں نے جلد از جلد کمرہ بدلنے کا فیصلہ کر لیا اور یونیورسٹی کے مختلف ہوسٹلوں میں درخواستیں بھیج دیں، جہاں پر طالب علموں کو اچھی خاصی مراعات ملتی تھیں اور انہیں بے شمار قسم کی آزادیاں حاصل تھیں، جو پرائیویٹ گھروں میں میسر نہ تھیں۔ چند دنوں کے اندر ایک ہوسٹل سے مجھے انٹرویو کے لئے بلاوا آ گیا، جس کا پیٹرن ان چیف سیاسیات کا پروفیسر تھا اور جو خود بھی جنگ کے زمانے میں جلاوطنی کی زندگی گذار چکا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے دل میں غیر ملکی طالب علموں کے لئے خاص ہمدردی پائی جاتی ہے۔ چونکہ سیاسیات بطور ضمنی مضمون کے میرے تعلیمی پروگرام میں

شامل تھا، اس لئے مجھے اس کے پاس یوں بھی ایک روز جانا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک پتھر سے دو شکار کئے جائیں۔ چنانچہ انٹرویو کے دوران میں بات کو گھما پھرا کر سیاسیات کے مضمون کی طرف لے گیا اور بتایا کہ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے سیاسیات میں بی۔اے کر رکھا ہے، جہاں پر پڑھایا جانے والا کورس آکسفورڈ یونیورسٹی کے پیٹرن پر بنایا گیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ میرا انٹرویو لینے والا پروفیسر آکسفورڈ کے ایک کالج میں یہ مضمون پڑھاتا رہا تھا۔ اس کو یہ جاننے کا شوق تھا کہ ہمارے کورس میں کون کون سی کتابیں رکھی گئی تھیں اور ان کے علاوہ میں نے اس مضمون کے سلسلے میں کیا کچھ پڑھ رکھا تھا۔ اس نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ میں اس کا لیکچر سننے اور اس کی سیمناروں میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس گفتگو کے بعد مجھے کمرہ ملنا یقینی ہو گیا تھا، جس کی تصدیق تیسرے روز موصول ہونے والے خط سے ہو گئی۔ اس میں لکھا تھا کہ میرے لئے ایک کمرہ ریزرو کر لیا گیا تھا، جس کا قبضہ مجھے اگلے روز مل سکتا ہے۔ لیکن اگر میں کسی وجہ سے فوراً قبضہ نہیں لیتا، تو کمرہ کسی دوسرے طالب علم کو دے دیا جائے گا۔

گو ہلکے کا کمرہ چھوڑنے کے لئے معاہدے کی رو سے ضروری تھا کہ میں پندرہ دن کا نوٹس دوں۔ اور اگر میں فوری طور پر کمرہ چھوڑنا چاہتا تھا، تو مجھے ایک ماہ کا کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ میرا دل گو ہلکے کی فرعونیت سے بھر چکا تھا اور میں فوری طور پر اس کے مکان سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر میرے پاس نہ تو پندرہ دن کا نوٹس دینے کے لئے وقت تھا اور نہ ہی میں ایک ماہ کا کرایہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس بارے میں اپنے دوستوں سے مشورہ مانگا، تو اولریکے نے کہا کہ حرجانہ ادا کرنے سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ گو ہلکے تمہیں فی الفور کمرہ خالی کرنے کا نوٹس دے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اس پر اولریکے نے ہنستے ہوئے کہا کہ اگر گو ہلکے کے بارے میں تمہاری بیان کردہ باتوں میں سے نصف بھی درست ہیں، تو پھر وہ ایسا ضرور کرے گا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے شام کو گھر پر ملنے کے لئے آئے گی۔

اولریکے نو بجے آئی، جب گو ہلکے آدھ گھنٹہ پہلے اپنی بیوی کو شب بخیر کہہ کر اور رواج کے مطابق بوسہ دینے کے بعد سونے کے لئے بیڈ روم میں جا چکا تھا۔ گھنٹی اولریکے نے اتنے زور شور سے بجائی کہ اگر گو ہلکے نے اپنے کانوں میں روئی بھی ٹھونس رکھی تھی، تب بھی وہ اس شور کو سن کر بستر سے اچھل پڑا ہو گا۔ دروازہ گو ہلکے کی بیوی نے جا کر کھولا۔ اولریکے نے بلند آواز میں کہا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے آئی ہے۔ مگر پیشتر اس کے کہ مائیکے کوئی جواب دیتی، میں نے گو ہلکے کی آواز سنی، جو اپنے بیڈ روم سے نکل کر کوریڈور میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے کہا یہ ملنے کے لئے آنے کا کونسا وقت ہے؟ میں بھی اس دوران میں

اپنے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ میں نے کہا میرے ملاقاتیوں کے ساتھ اسے بدتمیزی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ دس بجے تک میں جس کو چاہوں اپنے پاس آنے کی دعوت دے سکتا ہوں۔ گوہلکے غصے کے مارے ہانپتا کانپتا اور بڑبڑاتا ہوا بیڈروم میں غائب ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی بیوی کا رنگ آنے والے طوفان کے پیش نظر فق ہوگیا تھا۔ اگلے روز ہماری توقع کے مطابق مجھے فوراً کمرہ خالی کرنے کا نوٹس مل گیا۔ میں نے اسی روز اپنے دوستوں کی مدد سے نقل مکانی کر لی اور گوہلکے کو اپنی یادداشت میں سے کھرچ کر نکال دیا۔

ٹانٹے ایرینا نے برسوں کے بعد ایک بار ذکر کیا کہ گوہلکے کی بیوی سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر مرگئی تھی اور گوہلکے نے کسی مالدار عورت کے ساتھ یاری گانٹھ لی تھی، جو گوٹنگن میں رہتی تھی۔ وہ ہمبرگ سے نقل مکانی کر کے وہاں پر جا بسا تھا۔ اس سے زیادہ شاید وہ اس کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔ یوں بھی اسے پتہ تھا کہ مجھے گوہلکے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لئے نہ میں نے بات کو آگے بڑھانا چاہا، نہ ٹانٹے ایرینا نے اس سے زیادہ بتانا پسند کیا۔

پورے ستائیس برسوں کے بعد میرا آمنا سامنا گوہلکے کے ساتھ ٹانٹے ایرینا کی سالگرہ کی پارٹی میں ہو رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف لپکا اور اس نے بڑی گرمجوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ بلکہ اس نے اصرار کیا کہ میں اس کے پہلو والی کرسی پر بیٹھوں، جو اتفاق سے خالی تھی۔ اس کی عمر رسیدگی کے پیش نظر میں اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر صحت مند لگ رہا تھا۔ اس کے گال، جو کسی زمانے میں زردی مائل ہوا کرتے تھے، اب سیب کی طرح لال سرخ تھے۔ میں نے اس کی صحت مندی کا راز جاننا چاہا، تو اس نے کہا کہ بس اللہ کی دین ہے، وہ جس کو چاہے دیتا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ ٹانٹے ایرینا کو کیوں نہیں دیتا، جو عمر میں تم سے پانچ برس چھوٹی ہے، مگر بیس برس تم سے بڑی لگتی ہے۔ اور تم اتنی پھرتی سے ادھر ادھر پھدک رہے ہو، جیسے تمہارا گنٹھیا کا پرانا مرض جاتا رہا ہے۔

تم کو یقین تو نہیں آئے گا، گوہلکے نے کہنا شروع کیا، مگر میں تم کو اس کی کہانی سناتا ہوں، جو اس طرح شروع ہوتی ہے کہ میری بیوی مائیکے کے مرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ کتنی کرموں والی عورت تھی۔ مجھے گھر بار چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس لئے چند ہفتوں کے اندر اندر میری زندگی کے تانے بانے ٹوٹنے لگے۔ اتفاق کی بات ہے کہ مجھے انہی دنوں میں ہیلتھ انشورنس کی طرف سے بحالیٔ صحت کی کلینک میں بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ وہاں پر میری ملاقات ایک ادھیڑ عمر کی بیوہ عورت سے ہوئی، جس کا خاوند تھوڑا

عرصہ پہلے مرا تھا۔اس بات کا علم مجھے بعد میں جا کر ہوا کہ وہ اس سے قبل بھی دو بار بیوہ ہو چکی تھی۔ ہماری آپس میں خوب بنتی تھی، اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ جلد از جلد شادی کر لی جائے۔

میں نے کہا کہ یہ بھی خوب رہی کہ وہ ایک مرد سے نجات پانے کے بعد اتنی جلدی دوسرے کی غلامی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈالنے کے لئے تیار تھی۔

گوہلکے نے میری طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کہانی کو جاری رکھا اور کہا کہ اس کی نئی بیوی کرسٹا اور پہلی بیوی مائیکے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مائیکے خاموش طبع اور صلح کن تھی، جب کہ کرسٹا سخت لڑاکی عورت تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے تینوں مردوں کو زمین تلے پہنچا کر آرام کیا تھا۔ میرے ساتھ بھی اس کی جنگ برابر چلتی تھی، مگر تم جانتے ہو کہ میں بھی حد درجہ بد دماغ ہوں۔اس لئے ہمارے گھر میں دن رات پرزے اڑا کرتے تھے۔کبھی اس کے، کبھی میرے اور کبھی دونوں کے۔مگر مجھے ان لڑائیوں میں خوب مزا آتا تھا۔

میں نے پوچھا تم ماضی کے صیغے میں کیوں بات کر رہے ہو؟ کیا اب مزا نہیں آتا یا تم نے آپس میں صلح کر لی ہے؟

گوہلکے نے ارد گرد گھوم کر دیکھا، جیسے وہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ کوئی اس کی بات تو نہیں سن رہا۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا کرسٹا عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بے قصور ہے۔

کس چیز میں بے قصور؟ میں نے پوچھا۔

اس پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے اپنے پہلے تینوں خاوندوں کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے کی نیت سے ان کو زہر دے کر مار ڈالا تھا۔اس کے ایک سابقہ خاوند کے بیٹے نے سالہا سال کی مقدمہ بازی کے بعد عدالت کے حکم سے باپ کی لاش کو قبر سے نکلوا کر اس کی طبی تفتیش کرائی، تو پتہ چلا کہ اس کو زہر دے کر مارا گیا تھا۔ پھر پہلے اور دوسرے خاوند کی لاشیں بھی نکالی گئیں اور ان کی ہڈیوں میں بھی زہر کے آثار ملے۔مگر میں نے کرسٹا کے حق میں گواہی دی ہے۔ کیونکہ اس کے دیئے ہوئے زہر کے سبب میرا گنٹھیا کا مرض جاتا رہا ہے۔ میں نے کرسٹا کی منتیں کیں کہ وہ مجھے اس زہر کا نسخہ بتا دے، جو وہ مجھے دیتی رہی ہے، تاکہ میں اپنا علاج جاری رکھ سکوں، مگر وہ خود غرض عورت اس کے لئے تیار نہ ہوئی۔

(کمر فیلڈ۔۱۳ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

مردہ مچھلیاں

میں ہمبرگ سے کولون جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہوا، تو اس کمپارٹمنٹ میں، جس میں میری سیٹ ریزروتھی، ایک بڑی طرحدار لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور وہ بھی کمپارٹمنٹ کی واحد ریزرو سیٹ پر، جو دراصل میرے لئے مخصوص تھی۔ چونکہ ہم دونوں کے سوا کوئی تیسرا مسافر وہاں پر موجود نہ تھا، اس لئے میں باقی کی پانچ خالی سیٹوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے لئے اس کے بالمقابل والی سیٹ کا انتخاب کیا۔ جو اس کی سیٹ کی طرح کھڑکی سے ملحق تھی، مگر گاڑی چلنے کی سمت کے الٹے رخ پر تھی۔ بعض لوگوں کو ایسی سیٹوں پر بیٹھنا پسند نہیں ہے، کیونکہ گاڑی ان کی پشت کی سمت میں چلتی ہے۔ میں نے گمان کیا کہ وہ لڑکی بھی شاید ان لوگوں میں شامل ہے، وگرنہ وہ ایک پہلے سے کسی اور کے لئے ریزروشدہ سیٹ پر نہ بیٹھتی۔ ریزرویشن کی چٹ بدستور کمپارٹمنٹ کے دروازے پر لگی ہوئی تھی۔ مجھے ذاتی طور پر اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ گاڑی آگے کو جا رہی ہو یا پیچھے کو۔ یوں بھی میں سفر کے دوران پڑھنے کے لئے کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں اور عام طور سے سارا راستہ اسی میں ڈوبا رہتا ہوں۔ البتہ کوئی خوبصورت پری مل جائے، جو باتیں کرنے کے موڈ میں ہو، تو میں اپنا وقت اس کے ساتھ گفت وشنید میں گذارنا پسند کرتا ہوں۔

اس روز والی پری مجھ سے بھی بڑھ کر باتیں کرنے کی رسیا نکلی۔ اس کو میرے بارے میں جاننے کا شوق تھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے ہوں۔ اس نے خود ہی قیاس لگانا شروع کیا کہ میں عرب یا ترک نہیں ہوں اور ایرانی بھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ میرے تلفظ میں فارسیوں والا لہجہ سنائی نہیں دیتا۔ میں نے اس کی بات کو آگے بڑھایا اور کہا کہ واضح طور پر میں افریقن بھی نہیں ہوں، کیونکہ میری چمڑی ان کی طرح کالی نہیں ہے۔ چینی اور جاپانی بھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ نہ تو میری ناک ان کی طرح چپٹی ہے اور نہ ہی میرا رنگ زردی مائل ہے۔ اس نے میری براؤن رنگت کے پیش نظر کہا کہ پھر برصغیر ہندو پاک باقی رہ

جاتا ہے۔مگر وہ نہیں کہہ سکتی کہ میں ہندوستانی ہوں یا پاکستانی۔

میں نے کہا: میں دونوں ہوں۔ پیدائش کے اعتبار سے جو برٹش انڈیا میں ہوئی تھی ، میں ہندوستانی ہوں، البتہ میں ایک ایسے خطے میں پیدا ہوا تھا جو آگے چل کر پاکستان کا حصہ بنا تھا، اس لئے میں پاکستانی بھی ہوں۔ پھر میں نے اسے مزید چکر دینے کے لئے کہا کہ دراصل میں جرمن ہوں اور اگر وہ چاہے، تو میں اسے اپنا شناختی کارڈ دکھا سکتا ہوں۔

اس نے کہا: یہ تو مانگے تانگے کی شناخت ہے۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ انسان اندر سے کیا ہے اور اس کا دل کس ملک کے حق میں دھڑکتا ہے۔

میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور پوچھا: کیا تم اندر سے وہی ہو، جیسی تم باہر سے نظر آتی ہو؟ اور کیا تمہارا دل جرمنی کے لئے دھڑکتا ہے؟

وہ لمحہ بھر کے لئے ٹھٹکی۔ پھر اس نے پوچھا: کیا تمہیں میرے جرمن ہونے کے بارے میں کوئی شک وشبہ ہے؟

میں نے کہا: تمہارے لب ولہجہ کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ تم جرمنی میں پیدا ہوئی تھیں۔ مگر تمہارے بالوں کی سیاہ رنگت ، اٹھتی ہوئی ناک ، ترشے ہوئے متناسب ہونٹ ، دہانے کی وضع قطع، براؤن آنکھیں، ان کی تیکھی بناوٹ اور تلوار کی طرح تنے ہوئے ابرو بتا رہے ہیں کہ تمہارے آباء واجداد جنوبی یورپ، شاید اسپین سے، آئے ہوں گے۔ مگر تمہاری جلد کی ملاحت اور کھلتے رنگ میں براون جھلک چغلی کھا رہی ہے کہ تمہارے خاندان کی جڑیں شاید بہت دن ادھر مشرق وسطی میں پائی جاتی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ لمحہ بھر کے لئے چکرا گئی۔

اس نے پوچھا: کیا تم انتھروپالوجسٹ ہو؟ کیونکہ یہ کچھ تو نازی جرمنی کے کرتا دھرتا بھی نہ جان پائے تھے، جنہوں نے آریانسل کو یہودیوں اور جپسیوں سے پاک کرنے کی خاطر اس مزعومہ سائنس کا سہارا لیا تھا اور انسانی کھوپڑیوں کی پیمائش کرائی تھی اور منہ، ناک، آنکھوں، کانوں، ہاتھوں اور پاؤں کی بناوٹ کا جائزہ لیا تھا۔ مگر نازی حکومت کے کارندے اس کے خاندان کے یہودی الاصل ہونے کے بارے میں نہ جان پائے تھے۔ اور وہ صاف بچ گئے تھے۔

اب میری باری چکرانے کی تھی، کیونکہ مجھے اس کے یہودی ہونے کا بالکل شبہ نہ ہوا تھا۔

اس نے بتایا کہ اس کا خاندان دو صدیاں قبل عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کیونکہ

صرف اس طریق سے وہ لوگ جرمن معاشرے میں امن وامان کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔اس زمانے میں یہودیوں کو شہری حقوق نہیں دیئے جاتے تھے۔عیسائی بپتسمہ ان کے لئے جرمن معاشرے میں داخلے کے ٹکٹ کا درجہ رکھتا تھا۔اس نے اپنا نام کرستینا بتایا، جو صریحی طور پر عیسائی نام ہے۔مگر اس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کا یہودی نام راحل ہے، جس کو قریبی رشتہ داروں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

میں نے پوچھا: تمہاری پہلی شناخت کونسی ہے؟ جرمن یا یہودی؟

اس نے جواب دیا: نسلاً میں یہودی ہوں، مگر قومیت کے اعتبار سے اولاً جرمن، پھر اسرائیلی۔

میں نے پوچھا: کیا تم مذہباً عیسائی ہو یا یہودی؟

کرستینا نے کہا: دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے عیسائی، مگر اندر سے پوری پوری یہودیت کی پیروکار۔

میں نے پوچھا: کیا تمہارے گردوپیش میں کسی کو پتہ ہے کہ تم مذہباً یہودی ہو؟

کرستینا نے جواب دیا: اس بات کو کوئی نہیں جانتا۔

میں نے کہا: تم نے مجھے اتنی آسانی سے کیوں یہ بات بتادی ہے؟

اس نے کہا: اس لئے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں اور تمہارا اس چیز کو جاننا یا نہ جاننا میری زندگی پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔اگر تم میرے ہمسائے یا کولیگ ہوتے، تو میں تمہیں یہ بات کبھی نہ بتاتی۔پھر تم خود بھی تو میری طرح ایک فالتو وجود ہو، جس کو جرمن معاشرہ دانت پیستے ہوئے قبول کرتا ہے۔

میں نے سن رکھا تھا کہ یورپ میں بے شمار یہودی اپنی شناخت کو چھپانے کے لئے عیسائی نام اختیار کر لیتے ہیں، بلکہ چرچ سروس میں بھی شامل ہوتے ہیں اور چرچ کے معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں۔مگر وہ لوگ اندر اندر یہودیت کے پیروکار رہتے ہیں اور چوری چھپے توریت پڑھتے اور اپنے مذہب کی رسمیں بجا لاتے ہیں، مثلاً جمعے کی شام سبت کو خوش آمدید کہنا اور کوشر گوشت کھانا۔میرے جرمن دوست بعض اوقات اس چیز کا ذکر کیا کرتے تھے۔ہمارے واقف کاروں میں بھی ایک دو ایسے آدمی پائے جاتے تھے، جن کی پیٹھ پیچھے لوگ ان کے یہودی ہونے کا تذکرہ کرتے تھے۔مگر یہ بات عام طور سے ایسے رنگ میں کہی جاتی تھی کہ اگر کوئی تصدیق کرانے پر اتر آئے، تو مکرنے کی گنجائش باقی ہو۔میں نے اپنے دوستوں سے یہ بھی سن رکھا تھا کہ جرمن یہودیوں کو پہلی نظر میں ہی پہچان جاتے ہیں۔اب

کرستینا مجھے بتا رہی تھی کہ اس کے واقف کاروں اور کولیگوں میں سے کسی کو اس کے یہودی ہونے کی خبر نہ تھی۔

کرستینا نے بتایا کہ ہٹلر کی نازی پارٹی کے زمانے میں، جب یہودیوں کا پیچھا کیا گیا اور لاکھوں انسانوں کو گیس چیمبروں میں مارا گیا، تو اس کے خاندان کے افراد اور ہزاروں دوسرے یہودی کسی نہ کسی طرح نازیوں کی نظر میں آنے سے بچ گئے تھے۔ اس کا باپ اسلحہ بنانے والی ایک فیکٹری میں اونچے عہدے پر تھا۔ اس لئے اس کو محاذ پر نہیں جانا پڑا تھا۔ اس کی ماں اسی فیکٹری میں سیکرٹری تھی۔ کرستینا ابھی بہت چھوٹی تھی۔ البتہ اس کا بھائی کنڈر گارٹن میں جاتا تھا، جہاں پر ان کو صبح کے وقت "ہائیل ہٹلر" کے الفاظ دھرا کر اور بازو کو سامنے کی طرف تن کر سلام کرنا پڑتا تھا۔ جب اس نے ایک روز گھر پر "صبح بخیر" کی بجائے "ہائیل ہٹلر" کہا، تو باپ نے کہا کہ جرمن سلام بدستور "صبح بخیر" ہے نہ کہ "ہائیل ہٹلر"۔ کرستینا کے بھائی نے کنڈر گارٹن میں جا کر دوسرے بچوں اور استانی کے سامنے یہ بات بڑے فخر سے دھرا دی۔ شام کے وقت اس کی استانی ان کے گھر پر یہ کہنے کے لئے آئی کہ بچے کو ایسی باتیں نہ سکھایا کریں، وگرنہ کسی نے گسٹاپو کے پاس شکایت کر دی، تو مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔

اتفاقی طور پر سارے سفر کے دوران کوئی دوسرا مسافر ہمارے ڈبے میں نہ چڑھا اور ہم چار گھنٹوں تک کھلے بندوں اس نازک موضوع کے مختلف پہلوؤں اور جرمنی میں غیر ملکیوں سے امتیازی سلوک کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کرستینا کا سفر کولون میں پہنچ کر ختم ہوا۔ مجھے آگے جرمنی کے دارالحکومت بون جانے کے لئے وہاں سے گاڑی بدلنی تھی۔ کرستینا نے اپنا فون نمبر لکھ کر دیا اور کہا کہ اگلی بار مجھے وہاں سے گذر کر بون جانے کا اتفاق ہو، تو اس کو اطلاع کر دوں۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر آ جائے گی اور ہم گپ شپ کے لئے ایک دو گھنٹے کسی ریستوراں میں جا کر بیٹھیں گے۔

تھوڑے دنوں کے بعد مجھے کولون ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں شامل ہونے کی دعوت ملی، جو اتوار کے روز دوپہر کو نشر ہوتا تھا۔ اس پروگرام کا انچارج مشہور صحافی ویرنر ہوفر تھا، جو غیر ملکی صحافیوں کے ساتھ مل کر بین الاقوامی حالات کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ یہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی بات ہے، جب مشرقی پاکستان ملک سے ٹوٹ کر بنگلہ دیش بن گیا تھا اور پاکستانی فوج کے ۹۳ ہزار افراد جنگی قیدی بن چکے تھے۔

میں نے کرستینا کو فون پر اپنے کولون آنے کی اطلاع دی اور پوچھا کہ کیا اس سے اتوار کے روز متذکرہ ٹیلی ویژن پروگرام کے خاتمے پر ملاقات ہو سکے گی؟

اس نے کہا: ضرور ہوگی اور میں بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں پاکستانی فوج کی طرف سے اپنے ملک کے باشندوں پر روا رکھی جانے والی بربریت پر تمہاری کھال اتاروں گی۔

اتوار کے روز میں پروگرام نشر ہونے کے بعد اسٹوڈیو سے باہر نکلا، تو کرستینا دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے ٹیلی ویژن اسٹوڈیو کی انتظار گاہ میں بیٹھ کر ہمارا پروگرام دیکھا تھا۔ اس کو یہ بات اچھی نہ لگی تھی کہ میں نے پاکستانی حکومت کا دفاع کیا تھا اور شیخ مجیب الرحمٰن پر الزام لگایا تھا کہ اس نے ملک کی سلامتی کو توڑ کر قوم سے غداری کی تھی۔

اس نے کہا: کیا بنگالیوں کے حقوق کی خاطر لڑنا ملک وقوم سے غداری کے مترادف ہے؟ شیخ مجیب الرحمٰن کی پہلی وفاداری بنگالی قوم سے ہے، جس کے حقوق کو پاکستان میں پامال کیا گیا تھا۔

ہماری بحث دو گھنٹوں تک ہوتی رہی۔ رخصت کے وقت کرستینا نے بتایا کہ وہ کرسمس کی تعطیلات میں اسرائیل جارہی ہے۔ اس کے کولیگ سمجھتے تھے کہ وہ کرسمس کا تہوار مقدس مقامات پر منانے کے لئے جارہی تھی، جب کہ کرستینا جرمنی میں کرسمس کی گہما گہمی اور تحفے تحائف کی بھرمار سے بچنے کی خاطر ملک سے نکلنا چاہتی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ سال میں دو تین بار اسرائیل جایا کرتی تھی۔

اگلے دو تین برسوں کے دوران ہماری ملاقات نہ ہوسکی۔ کبھی اس کے پاس ملنے کے لئے وقت نہ ہوتا تھا اور کبھی میں کولون میں نہ رک سکتا تھا۔ البتہ ٹیلی فون پر ہمارا رابطہ لمبے وقفوں کے ساتھ قائم تھا اور مجھے اس کے پروگرام کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں عرب اسرائیلی جنگ کے بعد مجھے کرستینا میں واضح تبدیلی کے اثرات نظر آئے۔ ابتدائی دنوں میں اسرائیلی فوج کو مصری حملے کے نتیجے میں سویز سے پسپا ہونا پڑا تھا اور بہت سے اسرائیلی جوان مارے گئے تھے۔ مگر مجھے پتہ نہ تھا کہ کرستینا کا اسرائیلی منگیتر بھی مرنے والوں میں شامل تھا۔ یہ بات اس نے مجھے بہت دنوں کے بعد ایک ملاقات کے دوران بتائی۔ وہ اسرائیل سے کتے کا ایک پلا اٹھا لائی تھی، تاکہ اس ملک کا کوئی ذی جان اس کے آس پاس رہے۔

عرب ملکوں نے تیل کو اس جنگ میں بطور ہتھیار استعمال کیا تھا اور مغربی دنیا کے لئے تیل کی سپلائی وقتی طور پر روک دی تھی، جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں پٹرول کی قیمت بڑھ گئی تھی اور پہلی بار یورپ کی آٹو باہنوں پر سے کاریں غائب ہوگئی تھیں۔ اس چیز کا اثر ساری دنیا کی معاشیات پر پڑا تھا۔ پھر اسرائیل کے فلسطینی ویسٹ بینک پر قبضہ کر لینے کے نتیجے میں سارے یورپ میں عمومی طور پر، مگر جرمنی

میں بالخصوص اس ملک پر تنقید بڑھتی جا رہی تھی اور جرمن یہودی پھر ایک بار اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ کرستینا کا اس سلسلے میں استثنا نہ تھا۔ اس نے پہلی بار میرے سامنے جرمنی سے ہجرت کرنے کے ارادے کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ اسرائیل جا کر آباد ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہے۔

میں نے کہا: اسرائیل میں بھی تم کو تحفظ نہ مل سکے گا۔ اس ملک کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی گئی ہے کہ فلسطینی عربوں کو اس ملک سے نکال دیا جائے اور ان کی جگہ پر ساری دنیا سے یہودیوں کو لا کر آباد کیا جائے۔ کیا تم ایک ایسے ملک میں اطمینان کی زندگی بسر کر سکتی ہو، جہاں پر لوگوں کو بندوق اپنے سرہانے رکھ کر سونا پڑتا ہے۔

دوسری طرف کرستینا کی بے اطمینانی کچھ ایسی غلط نہ تھی۔ جرمنی میں نئی نازی پارٹیاں سر اٹھا رہی تھیں، جن کا پروگرام یہ تھا کہ غیر ملکیوں کو جرمنی سے نکال دیا جائے۔ وہ لوگ یہودیوں کا صرف نام نہیں لیتے تھے۔ مگر ہر کوئی جانتا تھا کہ "غیر ملکیوں" میں وہ یہودیوں کو بھی شمار کرتے تھے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں ملک میں بہت ہلچل پائی جاتی تھی اور یہودی اور دوسرے غیر ملکی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ اکا دکا افراد پر حملے بھی ہوئے، مگر اجتماعی طور پر ملک کے حالات کچھ ایسے تشویش ناک نہ تھے۔ اس زمانے میں مغربی جرمنی میں پچاس ساٹھ لاکھ کے لگ بھگ غیر ملکی رہتے تھے اور یہودیوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اس تعداد میں وہ یہودی شامل نہیں، جو کرستینا کی طرح اپنی شناخت کو چھپا کر رکھتے تھے۔ ان کی صحیح تعداد کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس کے بعد میرا رابطہ کرستینا سے ٹوٹ گیا۔ مجھے لمبے عرصے تک پتہ نہ چل سکا کہ وہ بدستور جرمنی میں مقیم ہے یا ملک سے باہر چلی گئی ہے۔ بہرصورت کولون والا فلیٹ اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اگر اس نے اسی شہر میں مکان بدلا ہوتا، تو یقیناً اپنا پرانا ٹیلی فون نمبر اپنے ساتھ لے جا سکتی تھی۔ چونکہ اس نمبر کے تحت کنکشن نہیں تھا، اس لئے میں نے باور کر لیا کہ وہ کم سے کم اس شہر کو چھوڑ گئی ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ جرمنی کو خیر باد کہہ کر اسرائیل چلی گئی ہو۔ اس ارادے کا ذکر وہ مجھ سے ہماری آخری ملاقات میں کر چکی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسرائیل جا کر فلسطینیوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کرے گی۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ پانچ برسوں کے بعد میں پھر اس سے ملنا اور یہ جاننا چاہوں گا کہ اس نے وہاں پر فلسطینیوں کو ان کے حقوق دلانے کے سلسلے میں کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

گذشتہ صدی کی آٹھویں دہائی میں مجھے ایک کانفرنس کے سلسلے میں قاہرہ جانے کا اتفاق ہوا، جہاں پر شرق اوسط میں آنے والی تبدیلیوں کے پیش نظر اس بارے میں سوچ بچار ہونی تھی کہ مستقبل میں اسرائیل کی پوزیشن اس علاقے میں کیا ہوگی۔ اسرائیل سے درجن بھر ڈیلیگیٹ آ رہے تھے، جن میں یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے علاوہ اسرائیلی وزارتوں کے اہم کارکن بھی شامل ہو رہے تھے۔ میرے سامان میں جہاں پر دوسری چیزیں بندھی ہوئی تھیں، وہاں پر میں نے اپنے رومال میں یادداشت کی خاطر ایک گانٹھ اس بات کے لئے بھی ڈال رکھی تھی کہ میں ان سے کرستینا کو تلاش کرنے کی درخواست کروں گا۔ میں نے ایک دو اسرائیلی نمائندوں سے اس بارے میں بات کی، تو انہوں نے معذوری کا اظہار کیا۔ البتہ ان میں سے ایک ڈیلیگیٹ کے ماں باپ جرمنی سے تھے۔ مگر اس کی اپنی پیدائش اسرائیل کی تھی اور وہ جرمن کولونی سے کچھ ایسا واقف نہیں تھا۔ اس نے اس بارے میں اپنے والدین سے فون پر پوچھ کر بتانے کا وعدہ کیا۔

اگلے روز وہ یہ پیغام لایا کہ صرف کرستینا اور راحل ناموں کی بنا پر تلاش کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اسرائیل میں ہر چوتھی پانچویں عورت کا نام راحل ہے۔ اور جرمنی میں یہودی لڑکیوں کو بیشتر اوقات کرستینا نام دیا جاتا تھا۔ اس لئے ضروری ہوگا کہ میں کرستینا کا فیملی نام انہیں بتاؤں۔

میں نے اپنی یادداشت پر زور دیا، تو یاد آیا کہ کرستینا کا فیملی نام قریب قریب وہی تھا، جو میری طالب علمی کے زمانے میں ہمبرگ یونیورسٹی کے فارسی ادبیات کے یہودی پروفیسر کا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کا نام ہنز تھا۔ اب مجھے کرستینا کا فیملی نام ہنزے بھی یاد آ گیا۔

جوشوا نے یہ نام ٹیلی فون پر اپنی ماں کو بتایا، تو وہ ہنس ہنس کے دھری ہوگئی۔ اس نے کہا: جرمنی میں ہر تیسرے چوتھے یہودی کا یہی یا اس سے ملتا جلتا فیملی نام تھا۔ اکثر لوگوں نے اسرائیل پہنچ کر قدیمی یہودی فیملی نام اختیار کر لئے تھے اور وہی نام اب ٹیلی فون ڈائرکٹری میں درج ہیں۔ پچھلے جرمن ناموں کی اہمیت بس تاریخی رہ گئی ہے، جن کو عام طور سے قریبی رشتہ داروں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ مگر اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے اس بارے میں پوچھے گی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کو کرستینا ہنزے کا پتہ ہو۔

یہودی معاشرے کی خاص صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ ہر خبر ہوا کی تیزی سے پھیل جاتی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس بات کا چرچا پورے اسرائیلی وفد میں ہو رہا تھا کہ میں کسی کرستینا ہنزے کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ ایک شام کانفرنس کے شرکاء ایک دعوت میں مدعو تھے۔ اس

موقع پر اسرائیلی وفد کے مختلف افراد نے مجھ سے کرستینا ہنزے کے بارے میں جاننا چاہا کہ میں اسے کیسے اور کب سے جانتا ہوں اور ہماری دوستی کی نوعیت کیا ہے؟ وفد کا ایک رکن، جو آرمی میں میجر تھا اور جس کے بارے میں مصری دوستوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سیکریٹ سروس کا آدمی لگتا ہے، مجھ پر خاص طور پر مہربان تھا، کیونکہ وہ کسی زمانے میں پورے پاکستان میں گھوم پھر چکا تھا۔ اس پر اس کے پاکستانی مہمان نوازوں نے اتنا اچھا اثر چھوڑا تھا کہ وہ بدلے میں چاہتا تھا کہ میں اسرائیل کے بارے میں ویسا ہی مثبت تاثر لے کر جاؤں۔

میں نے پوچھا: تم اسرائیل کا شہری ہوتے ہوئے پاکستان میں کیسے داخل ہوئے تھے؟ تمہیں تو اس ملک میں داخل ہونے کا انٹری ویزا نہیں مل سکتا۔

اس نے کہا: میں ایسے موقعوں پر اپنا برٹش پاسپورٹ نکال لیا کرتا ہوں۔ اس پاسپورٹ کی برکت سے مجھے پاکستان میں گذرنے والے چار ماہ کے دوران ایک رات بھی کسی ہوٹل میں نہیں سونا پڑا تھا۔ جب میں ایک شہر سے دوسرے شہر جاتا تھا۔ تو پہلے شہر میں میرے مہمان نواز اگلے شہر میں اپنے دوستوں یا قرابت داروں کے ہاں میرے ٹھہرنے کا انتظام کر دیتے تھے۔ اس طرح میں نے پاکستان کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک سروے کیا، جسکے لئے میں پرانے برٹش نقشے ساتھ لے کر گیا تھا۔

میں نے کہا: پھر تو تم پاکستان کو مجھ سے بہتر جانتے ہو گے۔

اس نے جواب دیا: تم اس ملک کی کسی بھولی بسری بستی کا نام لو اور میں تم کو بتا دوں گا کہ وہ کس علاقے میں ہے اور اس کی آبادی کتنی ہے۔

میں نے کہا: کیا تم مجھے کرستینا ہنزے کے بارے میں بھی بتا سکو گے؟

اس نے کہا: میں نے اس بارے میں اسرائیل سے معلومات منگوائی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ چند برسوں تک حیفہ میں مقیم رہی تھی۔ مگر اس دوران میں اسرائیل کو چھوڑ کر امریکہ جا چکی ہے۔ اس کو ملنے کے لئے تمہیں امریکہ جانا پڑے گا۔ تم جانتے ہو کہ امریکہ بہت بڑا ملک ہے۔ تم اس کو کہاں پر تلاش کرتے پھرو گے؟

میرے لئے یہ خبر کافی تھی کہ کرستینا حیفہ میں مقیم رہی تھی۔ وہاں پر میرا ایک عرب دوست خلیل رہتا تھا، جو کسی زمانے میں جرمنی میں تعلیم کے سلسلے میں رہ چکا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کا حیفہ میں رہنے والے سابق جرمنوں سے رابطہ ہو گا۔ اور اگر وہ کرستینا کو خود نہ بھی جانتا ہوا، تو مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے

واقف کاروں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لے گا۔ وہ ڈاکٹریٹ کرنے کے لئے جرمنی آنے والا تھا۔ اس نے تھوڑا پہلے مجھ سے ہمبرگ یونیورسٹی کے بارے میں معلومات منگوائی تھیں اور لکھا تھا کہ وہ بہت جلد ہمبرگ پہنچنے والا ہے۔

خلیل کے ساتھ میں اکثر فلسطین کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ تم یورپ میں بیٹھ کر اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اسرائیل کی ریاست میں رہنے والے دس لاکھ فلسطینی عربوں کی زندگی کس طرح بسر ہوتی ہے۔ کسی روز خود آ کر دیکھو، تو تمہیں پتہ چلے کہ ہماری حیثیت تیسرے درجہ کے شہری کی ہے۔ یہ درست ہے کہ ہماری حالت ان فلسطینیوں سے بہتر ہے، جو ویسٹ بینک میں یا اردن اور لبنان کے مہاجر کیمپوں میں رہتے ہیں۔ وہ لوگ فی الواقع زندہ درگور ہیں۔ ان کے مقابلے میں اسرائیل میں رہنے والے فلسطینیوں کو کم سے کم زندہ رہنے دیا جاتا ہے، مگر یہ زندگی غلامی سے بدتر ہے۔ کوئی نہیں جانتا کب ہم سے یہ حق بھی چھین لیا جائے گا۔

میں نے خلیل سے کرستینا کے بارے میں پوچھا، تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ پتہ چلا کہ اسرائیل میں جنوبی افریقہ جیسا نسلی امتیاز پایا جاتا ہے، جس کے سبب عربوں اور یہودیوں کے درمیان ایک نہ پاٹی جانے والی خلیج پائی جاتی ہے۔ دونوں معاشرے پاس پاس رہتے ہوئے بھی الگ الگ محوروں میں گھوم رہے ہیں۔

دو تین برسوں کے بعد میں امریکہ گیا، تو میں نے نارتھ ویسٹ ائرلائنز سے سفر کرنے کا ارادہ کیا، جو اس زمانے میں ہمبرگ سے سیدھی نیویارک جاتی تھی۔ اس طرح مجھے فرانکفورٹ سے جا کر جہاز نہیں لینا پڑتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر تھوڑا سا زائد کرایہ ادا کر کے اس ائرلائنز کا "پاسپورٹ" نامی ٹکٹ خریدا جائے، تو انسان ایک ماہ تک شمالی امریکہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہاں چاہے اور جب چاہے اور جتنی بار چاہے سفر کر سکتا تھا۔ شرط بس اتنی تھی کہ سفر نارتھ ویسٹ ائرلائنز پر کیا جائے۔ میں نے سوچا کہ امریکہ کی سیاحت کا نہایت نادر موقع ہے۔ مگر میرے ذہن میں یہ بات بالکل نہیں تھی کہ میں وہاں پر جگہ جگہ کرستینا کو ڈھونڈتا پھروں گا۔ میں اس کو ملنے کا خیال دل سے نکال چکا تھا۔ یوں بھی اب وہ شادی شدہ تھی اور اس کے جملہ حقوق اس کے خاوند کے نام محفوظ تھے۔

امریکہ کے سفر کے دوران میں نے ایک ویک اینڈ کے لئے نیو اورلینز جانے کا ارادہ باندھا، کیونکہ یہ شہر امریکہ میں فرانسیسی روایات کا حامل اور تھیٹر اور موسیقی کے لئے مشہور ہے۔ نارتھ ویسٹ ائر

لائنز کا مرکز چونکہ ڈیٹرائیٹ میں ہے، اس لئے ہر طرف جانے کے لئے پہلے وہاں جانا پڑتا تھا۔ جب میرا طیارہ وہاں پر پہنچا، تو حدِ نظر تک برف پڑی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ ساری رات برف باری ہوتی رہی تھی اور آئندہ کئی گھنٹوں تک ہوتی رہے گی۔ ہمارا طیارہ اترنے کے بعد ہوائی اڈہ بند کر دیا گیا۔ اب کوئی جہاز وہاں پر نہ اتر سکتا تھا اور نہ وہاں سے پرواز کر سکتا تھا۔ ہر طرف سے آنے والے مسافروں کی بے تحاشا بھرمار تھی، جو سب سمٹ سمٹا کے ایک بڑی انتظار گاہ میں جمع تھے۔ میں بھی دوسروں کے ساتھ بیٹھا ہوا ٹیلی ویژن پر موسم کی خبریں دیکھ رہا تھا۔ پتہ چلا کہ دریائے مسسی پی میں بارشوں کے سبب سیلاب آیا ہوا ہے اور نیو اورلینز کا آدھا شہر پانی میں ڈوب چکا ہے۔ گویا مجھے اپنے سفر کے لئے نئی منزل تلاش کرنی ہوگی۔ میں اس سلسلے میں مشورہ لینے کے لئے انفارمیشن کونٹر پر گیا، جہاں پر اچھی خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ مگر پیشتر اس کے کہ میری باری آتی، کسی نے پیچھے سے میری پشت پر ٹھونکا مارا۔ میں نے گھوم کر دیکھا، تو میرے سامنے کرستینا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ بھی میری طرح اس ہوائی اڈے پر آ کر پھنس گئی تھی۔

اس نے پوچھا: تم یہاں پر کیا کر رہے ہو اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟

میں نے کہا: جانا تو میں نیو اورلینز چاہتا تھا، مگر اب شاید کیلیفورنیا جانا پڑے۔ کم سے کم وہاں پر سیلاب یا برف باری کا خطرہ نہیں ہوگا۔ مگر تم کہاں جا رہی ہو؟

کرسینا نے کہا: میں لاس انجلیز میں رہتی ہوں اور وہیں پر جا رہی ہوں۔ تم کیوں نہیں میرے ساتھ چلتے۔ تم جب تک چاہو میرے پاس ٹھہر سکتے ہو۔

میں نے کہا: تمہارا شوہر نامدار کیا کہے گا؟

کرستینا نے قہقہہ لگا کر کہا: اس نے جو کچھ کہنا تھا، وہ کہہ چکا ہے۔ اب میرے گلے میں کوئی پٹہ نہیں ہے۔ اگر میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو، تو اکٹھی سیٹیں بک کرا لیتے ہیں۔

برف باری اگلے دو تین گھنٹوں میں رک گئی اور رن وے کو کلیر کرنے کے بعد طیاروں کو پرواز کرنے کی اجازت مل گئی۔ پرواز کے دوران میں اس بات کی طرف لوٹا، جس کے لئے میں کرستینا کو ملنا چاہتا تھا۔ اس نے اسرائیل جانے سے پہلے کہا تھا کہ وہ وہاں پر فلسطینیوں کو ان کا حق دلانے کی کوشش کرے گی۔ میں سننا چاہتا تھا کہ اس نے اس بارے میں کیا کیا تھا۔

کرستینا نے بتایا کہ وہ ایک عرصے تک "پیس ناؤ" تحریک کے سرگرم کارکنوں میں سے تھی، جو فلسطینیوں کے ساتھ امن کا معاہدہ کرنے کے حق میں ہے۔ مگر جب سے روسی مہاجر لاکھوں کی تعداد میں

اسرائیل لائے گئے ہیں، اس وقت سے اس تحریک کا اثر رسوخ ختم ہو گیا ہے۔ کرستینا نے وزیر اعظم کے آفس کے سامنے سال بھر پکٹ لگائی رکھی تھی۔ وہیں پر اس کی ملاقات اپنے ہونے والے خاوند کے ساتھ ہوئی تھی، جو امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں اپنی اچھی بھلی نوکری کو چھوڑ کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر دوسرے ہم خیالوں کے ساتھ مل کر اسرائیلی حکومت پر زور ڈالا جائے، تو فلسطینیوں کے ساتھ امن کا معاہدہ ہو سکتا ہے۔ مگر پانچ برسوں تک اس سلسلے میں کام کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسرائیلی حکومت کا پلان دوسرا ہے۔ وہ فلسطینیوں کو ملک سے نکالنا چاہتی ہے نہ کہ ان کے ساتھ امن کا معاہدہ کرنا۔ وہ مایوس ہو کر امریکہ لوٹ گیا تھا اور راحل کو بیاہ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

کرستینا نے کہا: میں اسرائیل کے فاشسٹ ارادوں کو جان لینے کے بعد اس ملک سے اپنے آپ کو منسلک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، کیونکہ میرے اندر ابھی انسانیت کی رمق باقی ہے۔ پانی کے بہاؤ کے رخ پر صرف مردہ مچھلیاں تیرتی ہیں۔

(کمر فیلڈ۔ ۲۶ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

کلنک کا ٹکہ

سارا دن دفتر میں سر کھپانے کے بعد وہ گھر جانے کیلئے سٹی ٹرین میں بیٹھتے ہی اپنی تھکی ماندی آنکھیں موند لیتا تھا اور گرد و پیش سے کٹ کر من کی بتی کو جلا کر اس کی روشنی میں دن بھر کے کاموں، جھمیلوں، کامیابیوں، ناکامیوں اور کولیگوں کے ساتھ ہونے والی نوک جھونک پر نظر ثانی کرتا تھا۔ بہت سی الجھنیں اس مراقبے کے دوران سلجھ جاتی تھیں۔ مگر بعض اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ اس کی آنکھ لگ جاتی تھی اور وہ سچ مچ سو جاتا تھا اور اپنے برگ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر ہی جاگتا تھا، جو اس ٹرین کا آخری اسٹاپ تھا۔ وہاں پر پہنچنے سے تھوڑا پہلے لاؤڈ اسپیکر پر ساری سواریوں کو اگلے اسٹیشن پر اترنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ پھر گارڈ سارے ڈبوں میں جھانک کر اطمینان کر لیتا تھا کہ کوئی مسافر سویا ہوا تو نہیں رہ گیا۔ اسے وہاں سے آگے اپنے گاؤں جانے کے لئے بس لینی ہوتی تھی، جو عام طور سے چلنے کے لئے تیار کھڑی ملتی تھی۔

مگر یہ بھی نہیں ہے کہ وہ بالکل بے خبر ہو کر سویا رہتا تھا۔ وہ راستے میں تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد آنکھیں کھول کر گرد و پیش کا جائزہ لیتا اور ٹٹول کر اطمینان کر لیتا تھا کہ کسی نے اس کی جیب نہیں کاٹی اور اس کا ہینڈ بیگ بدستور اس کی گود میں محفوظ پڑا ہے، جس پر وہ دونوں بازو ٹکا کر بیٹھا ہوتا تھا۔ کھڑکی سے باہر کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اسے بتا دیتی تھی کہ گاڑی کس مقام پر پہنچی ہے اور ابھی آخری اسٹیشن کے آنے میں کتنا وقت باقی ہے۔ اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں پر ادھ کھلی آنکھوں سے ایک نظر اسے اطمینان دلا دیتی تھی کہ سب ٹھیک ہے۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھر آنکھیں میچ کر سوتے جاگتے عالم میں لوٹ جاتا تھا۔

اس روز بھی یہی ہوا۔ مگر پھر جیسے اس کے دماغ کے کسی بیدار خلئے نے اسے چوکنا کیا کہ تم نے ابھی ابھی ایک جانی پہچانی شکل دیکھی ہے۔ اس نے پھر ایک نظر ڈالنے کی جرات کی کہ شاید پہچان سکے

کہ وہ کون محترمہ ہے، جو اسے ایک ٹک گھور رہی ہے۔ مگر اس کی چہروں کو پہچاننے کی کمزوری آڑے آئی، جو عمر گذرنے کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نے اپنی یادداشت کو پھٹکارا کہ ایسی خوبرو عورت کو کوئی نام کیوں نہیں دیتی ہو۔ مگر اس نے ہمیشہ کی طرح اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اب اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یوں پوز کرے، جیسے اس نے محترمہ کو پہچان لیا ہے۔ مگر اس چیز میں ایک قباحت ہے کہ بعض اوقات ایسے موقعوں پر لڑکیاں بدک جاتی ہیں اور یہ کہہ کر مشکل میں ڈال دیتی ہیں کہ کسی لڑکی سے بات کرنے کا یہ حیلہ بہت پرانا، گھسا پٹا اور معیوب ہے۔ اس طرح انسان کی خواہ مخواہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے سامنے سبکی ہو جاتی ہے۔

عورت نے اس کی نگاہ میں پہچان کی دھیمی سی چمک دیکھی، تو خود بخود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے اس کی طرف بڑھا دیا۔ اسے اس کا نام اب بھی یاد نہ آیا، مگر عورت کے گالوں پر دوڑ جانے والی سرخی اور مصافحے کی گرمجوشی سے وہ جان گیا کہ ان کا تعلق اتنا بھی سرسری نہیں رہا ہوگا۔

"تم کہاں پر ہوتی ہو اور کیا کرتی ہو؟" اس نے پوچھا، جیسے وہ اسے پہچان گیا تھا۔

"یہیں ہمبرگ میں ایک جمنازیم میں پڑھاتی ہوں"۔ اس نے جواب دیا۔

" کون سے مضامین؟" اس نے پوچھا۔

"انگریزی اور جغرافیہ۔ میں اگلے ہفتے اپنی کلاس کے ساتھ ساؤتھ ویلز جا رہی ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے مجھے ایک زمانے میں لنکا شائر کے ایک دوست کا پتہ دیا تھا"۔

اب اسے سب یاد آ گیا۔ خدا کی مار وہ مائیکے کو کیسے بھول سکتا ہے۔ اس کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کی تفصیلات اس کی یادداشت میں محفوظ تھیں۔ وہ اپنے وقت کی ملکہ حسن تو خیر نہ تھی، مگر کسی سے ہیٹی بھی نہ تھی۔ جب اس کا تعارف مائیکے کے ساتھ ایک پارٹی میں ہوا، تو اس نے جانا تھا کہ اس نے بڑا تیر مارا ہے۔ مائیکے نے اس کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

"آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ، میں کاٹتی نہیں ہوں"۔

مائیکے اس زمانے میں بیس اکیس برس کی تھی اور یونیورسٹی کے دوسرے یا تیسرے سمسٹر میں پڑھتی تھی۔ اس کا چرچا ان دنوں اخباروں میں خوب ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کے نائیجیرین دوست کو جرمنی سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا گیا تھا۔ وہ طالب علمی کے ویزے پر آیا تھا، مگر اس نے پڑھنے پڑھانے

کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔ اس کی ملاقات مائیکے کے ساتھ کسی ڈانس پارٹی میں ہوئی تھی اور تھوڑے عرصے کے اندر مائیکے کو حمل ٹھہر گیا تھا۔ اس زمانے میں اسقاط حمل جرمنی میں ممنوع تھا اور یوں بھی مائیکے کیتھولک تھی اور چرچ کی تعلیم کے پیش نظر اسقاط نہیں کرانا چاہتی تھی۔ اس کے باپ کی شکایت پر پولیس نے اس کے نائیجیرین دوست کو زنا بالجبر کے الزام کے تحت گرفتار کر لیا تھا۔ مگر انکوائری کرنے والے جج کے سامنے مائیکے نے بیان دیا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اس کی رضامندی سے ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس کے دوست کو ملک سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا گیا تھا اور مائیکے ناراض ہو کر باپ کے گھر سے چلی گئی تھی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی بڑی بہن نے مائیکے کو اپنے پاس ٹھہرنے کی دعوت دی تھی اور کہا تھا کہ وہ جب تک چاہے اس کے پاس رہ سکتی ہے۔

وہ یہ کہانی اخبارات میں پڑھ چکا تھا اور مائیکے کی تصویر بھی اس کی نظر سے گذری تھی۔ اس کا کیس ان دنوں یونیورسٹی میں ہر طرف زیر بحث تھا۔ طالب علموں نے اس کے نائیجیرین دوست کے ملک سے نکالے جانے کے حکم کے خلاف احتجاج کیا تھا اور مائیکے کے ساتھ ہمدردی کی قراردادیں پاس کی تھیں۔ وہ دراصل اس کی اس شہرت کے سبب اس کے پاس بیٹھنے سے کترا رہا تھا کہ کوئی مرد اس سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اس کا شمار آدم خوروں میں ہونے لگا تھا۔ دوسری طرف جب ایک بار کوئی قسمت کا مارا صحافیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، تو وہ اس کو آسمان پر چڑھانے یا زمین پر پٹخنے سے باز نہیں آتے۔ وہ مائیکے کی موہنی شکل وصورت کی طرف دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اس سے ڈرنے کی بھلا کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

پارٹی کے دوران مائیکے کے ساتھ باتیں کرنے سے اس نے جانا تھا کہ وہ خاصی ذہین لڑکی تھی، جس کے اندر تعصب بالکل نہیں پایا جاتا تھا۔ ہمبرگ یونیورسٹی میں افریقی طالب علموں کی تعداد اس زمانے میں آٹے میں نمک کے برابر تھی اور عام طور سے جرمنوں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ لڑکیاں بدکتی تھیں اور ان کے ساتھ ڈیٹ کرنے کے لئے بالکل تیار نہ ہوتی تھیں۔ اس کے برعکس مائیکے کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ افریقیوں کو جرمنوں پر ترجیح دیتی تھی، جس کے سبب یونیورسٹی میں اس کو "افریقن جورو" کے نام سے یاد کیا جانے لگا تھا۔ پتہ چلا کہ وہ قریب قریب سارے افریقی طالب علموں کو جانتی تھی اور ہر وقت ان کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتی تھی۔ ان میں سے کسی کو سرکاری محکموں سے کوئی کام ہوتا، یونیورسٹی میں داخلے کا مسئلہ، پارٹ ٹائم جاب یا رہائش کے لئے کمرہ حاصل

کرنے میں دقت کا سامنا، تو مائیکے فوراً اس کے ساتھ چل دیتی تھی اور اکثر و بیشتر کامیابی کے ساتھ اس کا مسئلہ حل کر دیتی تھی۔

وہ اس زمانے میں نیا نیا اسٹوڈنٹ یونین کی مجلس عاملہ میں چنا گیا تھا اور اس کے سپرد غیر ملکی طالب علموں کا شعبہ تھا۔ اس لئے اس نے مائیکے سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ پارٹی دینے والے لڑکے نے دور سے مائیکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: "تعارف تم یقیناً خود کرالو گے"۔ اس چیز کو مائیکے بھی جان گئی تھی اور اس نے پہل کرتے ہوئے اسے اپنے پاس بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔ پھر اس کی توقع کے برعکس مائیکے نے ساری شام افریقیوں کے مسائل کو چھیڑا تک نہ تھا۔ ان کی گفتگو جرمنوں کی سائیکی کے گرد گھومتی رہی تھی، جو مائیکے کی نظروں میں بہت الجھی ہوئی ہے۔ اپنے باپ کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ کچھ ایسا برا شخص نہیں ہے اور نہ ہی وہ غیر ملکیوں کے خلاف ہے۔ وہ صرف یہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیٹی دوسروں کی نظروں میں آئے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے، جو خاموشی کے ساتھ سر جھکا کر بسر اوقات کو کامیاب زندگی گذارنا سمجھتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے باپ نے یہ چیز نازی ڈکٹیٹر شپ کے زمانے میں اختیار کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے خاندان کی تاریخ اپنے آپ کو دھرائے۔ مگر مائیکے کو پتہ نہیں تھا کہ اس کے باپ کا اشارہ کس بات کی طرف تھا۔

مائیکے اس دوران میں ایک بچی کو جنم دے چکی تھی، جو اپنے افریقی باپ کی طرح کالی کلوٹی تھی۔ اس کی تصویریں اس نے اپنے پرس میں سے نکال کر دکھائیں۔ بلکہ اس نے اسے وہ تصویر بھی دکھائی، جس میں بچی کو مائیکے کے باپ نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے باپ کا سارا غصہ بچی کی پیدائش کے بعد جاتا رہا تھا۔

"وہ اس سے اتنا پیار کرتا ہے کہ دن رات اس کے نخرے اٹھاتا ہے اور اس کی عادتیں بگاڑ رہا ہے"۔ مائیکے نے ہنستے ہوئے اسے بتایا۔

اس زمانے میں طالب علموں کے پاس ذاتی کاریں کم ہی ہوتی تھیں اور شبینہ پارٹیاں ساری رات جاری رہتی تھیں۔ پہلی ٹرام صبح کے چار بجے چھوٹتی تھی اور اپنے کام پر جانے والے مزدوروں اور پارٹیوں سے گھر لوٹنے والے طالب علموں سے بھری ہوئی ہوتی تھی۔ جب وہ اس صبح اپنے مہمان نواز سے رخصت ہو کر باہر نکلے، تو مائیکے اس کا بازو تھامے ہوئے تھی اور اسی کی تجویز پر وہ دمتوڑ کے اسٹیشن پر ٹرام سے اتر کر آلسٹر جھیل کی طرف مڑ گئے تھے۔ مائیکے نے کہا تھا کہ ایسی سہانی صبح پیدل چل کر گھر جانا

چاہئیے ۔ چنانچہ وہ جھیل کے کنارے کنارے چل پڑے تھے۔سمت کا تعین مائیکے نے کیا تھا اور کہا تھا کہ اس کی بہن کا گھر وہاں سے بس آٹھ دس کلو میٹر دور ہے۔ گویا یہی کوئی دو تین گھنٹوں کے فاصلے پر۔مگر وہ جلد ہی اس کی باتوں سے جان گیا تھا کہ مائیکے کو گھر جانے کی کچھ ایسی جلدی نہ تھی۔ کیونکہ اس کی بیٹی اس روز اس کے ماں باپ کے گھر پر تھی، جو اس کی دیکھ بھال مائیکے سے بڑھ کر کرتے تھے۔ رہی اس کی بہن، تو اسے مائیکے کے دیر یا سویر گھر آنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہی نوجوانی کے دن ہیں، جب انسان راتوں کو اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق گذار سکتا ہے ۔ باقی کی ساری زندگی انسان کو معاشرے کی حدود کی قید میں کاٹنی پڑتی ہے۔

" کیا میں تمہیں اپنے ہاں چل کر ناشتہ کرنے کی دعوت دے سکتا ہوں؟" اس نے اپنی ساری ہمت کو سمیٹتے ہوئے کہا تھا۔

مائیکے کو اس کے کمرے میں جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔مگر اس کا ہوسٹل وہاں سے مخالف سمت میں تھا اور وہاں پر پہنچنے کے لئے انہیں ٹرام لینی پڑتی تھی، جو دمتوڑا اسٹیشن سے ملتی تھی۔ اس طرح وہ مائیکے کی بہن کے گھر کی طرف جانے کی بجائے آدھے راستے سے پچھلے قدموں پر چل دیئے تھے۔ اس عرصے میں سورج نکل آیا تھا اور اس کی پہلی کرنیں آلسٹر جھیل پر پڑ رہی تھیں۔ قسم قسم کے پرندے فضا میں اڑ رہے تھے۔ اکا دکا مرغابیاں مچھلیوں کا شکار کرنے کے لئے پانی میں غوطے لگا رہی تھیں۔ جھیل پر ابھی کوئی بادبانی کشتی نظر نہ آتی تھی۔ البتہ صبح کے وقت اکیلے دکیلے سیر کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دو جوگنگ کرنے والے بھی انہیں راستے میں ملے۔مگر اتنی صبح ان کے سوا کوئی دوسرا جوڑا جھیل کے کنارے چوما چاٹی کرتا ہوا دکھائی نہ دیتا تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ ان کا فلرٹ بس وقتی چیز ہے، جس کے بعد مائیکے اپنے افریقی دوستوں کی طرف لوٹ جائے گی اور دونوں اپنے اپنے دھندوں میں لگ کر ایک دوسرے کو بھلا دیں گے۔

پھر ایک روز اس کو پتہ چلا کہ مائیکے کی منگنی ایک سوڈانی کے ساتھ ہوگئی ہے، جو اس کو اپنی فیملی سے ملانے کے لئے اپنے ساتھ سوڈان لے گیا ہے۔مگر تھوڑے دنوں میں وہ اکیلی واپس لوٹ آئی، کیونکہ اس کے منگیتر کی فیملی نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے ماں باپ اپنے بیٹے کی شادی ایک کنواری لڑکی کے ساتھ کرنا چاہتے تھے، جو مائیکے اب نہ تھی۔ وہ تو طلاق یافتہ بھی نہ تھی، کیونکہ اس کے نائیجیرین دوست نے اس کے ساتھ سرے سے نکاح ہی نہیں پڑھایا تھا۔ اور اس کی بیٹی حرام کی

پیدائش تھی۔ مائیکے نے یہ باتیں سنیں، تو خاموشی سے واپسی کا ٹکٹ کٹا کر جرمنی لوٹ آئی۔

پارٹی کی رات اور اگلے دن کے بعد، جو انہوں نے اس کے ہوسٹل میں گذارا تھا، ان کا آپس میں ملنا نہیں ہوا۔ ان کا کوئی مشترکہ دوست یار بھی نہیں تھا، جس کی زبانی اسے مائیکے کے بارے میں اور مائیکے کو اس کے متعلق خبریں ملتیں۔ یوں بھی ان کی واقفیت بس وقتی تھی۔ دونوں کے محور جدا جدا تھے اور ان کی منزلیں الگ الگ۔ ان کا پھر کبھی ملنا محض اتفاق پر مبنی تھا، جو ہمبرگ جیسے بڑے شہر میں روز روز وقوع میں نہیں آیا کرتا۔ یہ تو قسمت کا کرنا تھا کہ ایک عمر گذرنے کے بعد اس روز ان کا سیٹی ٹرین میں آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ وہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی سے اتر جائیں اور کسی ریستوران میں جا کر ایک آدھ گھنٹے کے لئے بیٹھیں اور ایک دوسرے کو اپنی اپنی زندگی کی کہانی سنائیں۔

مائیکے نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ کروپنڈر کے اسٹیشن پر اتر کر ایک پب میں جا کر بیٹھے، جو اس وقت اجاڑ پڑا تھا۔ ان کے سوا وہاں پر کوئی دوسرا گاہک موجود نہ تھا۔

"کیا تم اب بھی افریقیوں پر فریفتہ ہو؟" اس نے پوچھا۔

"اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے" مائیکے نے جواب دیا۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ تھوڑا عرصہ قبل سات سال تک نامیبیا میں رہنے کے بعد جرمنی واپس لوٹی تھی۔ وہاں پر اسے ایک جرمن اسکول میں پڑھانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ ملک انیسویں صدی میں جرمنی کی کالونی رہ چکا ہے، جس کے سبب آج بھی وہاں پر جرمن آبادی پائی جاتی ہے، جن کے بچوں کو پڑھانے کے لئے جرمن حکومت استاد بھیجتی ہے، تاکہ ان کو اپنے آباواجداد کی زبان نہ بھول جائے۔

"میں سفید فام افریقیوں کی بات نہیں کر رہا۔ میرا مطلب ہے کہ کیا تمہاری بلیک افریقیوں کے لئے محبت بدستور قائم ہے؟" اس نے جاننا چاہا۔

"تم بھی میرے باپ کی طرح باتیں کرنے لگے ہو۔ اسے مجھ سے یہی شکایت تھی کہ میں بلیک افریقیوں سے خاص محبت کرتی ہوں، جیسے یہ چیز کوئی جرم ہو"۔

"مجھے پتہ نہیں کہ تمہارا باپ کیوں اس چیز کو اچھا نہیں جانتا تھا۔ میں تو محض اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ہماری طالب علمی کے دنوں میں یہ چیز تم کو دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ اور تم کو پتہ ہوگا کہ لڑکوں نے تم کو "افریقن جورو" کا نام دے رکھا تھا" ۔اس نے جواب دیا۔

مائیکے نے ہنستے ہوئے اسے بتایا کہ اس نے سچ مچ ایک افریقن سے شادی کی تھی، جس کے

ساتھ اس کا پیرس میں ملنا ہوا تھا۔ وہ کامیرون کا رہنے والا تھا اور پیرس میں سیاسی پناہ لے کر رہ رہا تھا۔ چونکہ وہ اپنے ملک واپس نہیں جا سکتا تھا، اس لئے مائیکے کو وہاں پر جا کر رہنے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ دوسری طرف اس کا خاوند فرانسیسی زبان اور کلچر کا ایسا رسیا تھا کہ وہ جرمنی میں آ کر رہنے کے لئے بالکل تیار نہ تھا، جہاں پر مائیکے ایک جمنازیم میں استانی تھی۔

"تمہاری بیٹی تو جوان ہو گی۔ تمہارا باپ اس کے بارے میں اب کیا کہتا ہے؟"

"میری بیٹی کرسٹل کبھی کی اپنے پاؤں پر کھڑی ہے۔ مگر میرے باپ کو یہ دن دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اس کی وفات کے وقت کرسٹل ابھی پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔ البتہ میری ماں ابھی حیات ہے۔ وہ کرسٹل پر بے حد فخر مند ہے"۔

" کیا باپ نے تمہیں افریقیوں سے میل ملاپ رکھنا معاف کر دیا تھا؟ تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تم لوگوں کی نظروں میں آ ؤ۔ جبکہ تم اس بات کو نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ تم نے کہا تھا کہ اگر تم لوگوں کی نظروں میں آ ؤ گی، تو کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا"۔

"اس وقت مجھے اس کی باتیں بری لگتی تھیں، کیونکہ ان سے تنگ نظری کی بو آتی تھی۔ مگر جب میں آج مڑ کر دیکھتی ہوں، تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس کے خدشات غلط نہ تھے۔ مجھ سے بڑھ کر کرسٹل کو اس چیز کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ اس کو زندگی بھر قدم قدم پر اس امر کا احساس دلایا جاتا رہا ہے کہ وہ کالی ہے۔ بچوں کے لئے دوسروں سے مختلف ہونا بہت تکلیف دہ امر ہے۔ وہ آج بھی معاشرے میں پائے جانے والے نسلی امتیاز کی شکایت کرتی ہے"۔

"تمہارے خاندان کی تاریخ میں کیا امر پیش آیا تھا، جس کے بارے میں تمہارے باپ نے کہا تھا کہ وہ اس کے دھرائے جانے سے بچنا چاہتا ہے۔ کیا تمہارے باپ نے تمہیں اس بارے میں کچھ بتایا تھا؟"

"میرے باپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ جب میں نے ماں سے پوچھا، تو اس نے صرف اس قدر کہا کہ تمہارا باپ نہیں چاہتا تھا کہ تمہارا خاتمہ پھوپھی ہیلینا کی طرح ہو، جو خودکشی کر گئی تھی"۔

"اس کی خودکشی کا سبب کیا تھا؟"

"ماں کو بھی کچھ پتہ نہیں، کیونکہ اس کی ملاقات اس زمانے میں ابھی میرے باپ سے نہیں ہوئی تھی۔ میرا باپ ایسٹ پروشیا کا رہنے والا تھا، جو بعد میں پولینڈ کے قبضے میں آیا تھا۔ اس کے خاندان

کے سب افراد جنگ میں مارے گئے تھے اور وہ اکیلا باقی بچا تھا، کیونکہ وہ اس زمانے میں فرنٹ پر تھا۔اس نے ماں کو صرف یہ بتایا تھا کہ اس کی بڑی بہن نے جنگ سے پہلے خودکشی کر لی تھی، جس کا اسے ساری عمر رنج رہا تھا۔ ماں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی۔مگر میں اس راز کو جاننا چاہتی تھی، اس لئے میں اس کی ٹوہ میں لگ گئی اور میں نے باپ کے کاغذات کو چھان ڈالا۔آخر کار میرے ہاتھ ۱۹۳۸ء کا ایک اخباری تراشہ لگا، جس میں نازی پارٹی کے کارکنوں کی طرف سے نکالے جانے والے ایک جلوس کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔تصویر کے عین درمیان ایک لڑکی دکھائی دیتی تھی، جس کے گلے میں ایک بورڈ لٹک رہا تھا۔اس پر لکھا ہوا تھا:"میں ایک یہودی کی داشتہ ہوں اور جرمن قوم کے ماتھے پر کلنک کا ٹکہ"۔

(کمر فیلڈ۔۳ دسمبر ۲۰۰۲ء)

غیر معمولی مماثلت

اس روز ٹریفک خاصا سست تھا اور مجھے نظر آ رہا تھا کہ میں وقت پر دفتر نہ پہنچ سکوں گا، جہاں پر سویرے سویرے ایک میٹنگ رکھی گئی تھی۔ پتہ نہیں لوگ کیوں بارش کے دو قطرے گرنے پر اس قدر محتاط ہو جاتے ہیں کہ ٹریفک اپنی روزمرہ کی چال کو بھول کر رینگنا شروع کر دیتا ہے۔ اپنے گاؤں سے ہمبرگ آتے ہوئے آٹو باہن پر مجھے پون گھنٹہ لگ گیا تھا، جب کہ عام طور سے اس راستے پر پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگتے۔ البتہ جب شہر میں داخل ہونے کے بعد کاریں معمول کی رفتار پر دوڑنے لگیں، تو میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کار کو فاسٹ لین میں ڈال دیا۔ ایکا ایکی مجھ سے آگے جانے والی کار نے سڑک کے بیچوں بیچ بائیں ہاتھ مڑنے کے لئے اشارہ دیا اور ساتھ کے ساتھ رکنے کے لئے بریک لگا دی۔ مجھے بھی پوری قوت سے بریک لگانی پڑی اور میری کار اس کے پیچھے چالیس پچاس میٹر تک پھسلنے کے بعد اس سے بمشکل دو میٹر کے فاصلے پر جا کر رکی۔ میں نے احتیاطاً ہینڈ بریک لگا دی اور اطمینان کا سانس لیا کہ ٹکر لگنے سے بچاؤ ہو گیا تھا۔ مگر عین اس لمحے میری کار کو پیچھے آنے والی کار نے ٹکر ماری اور اسے تھوڑا سا آگے کی طرف دھکیل دیا۔ ابھی میں اس صدمے سے سنبھل نہ پایا تھا کہ پیچھے سے تیسری اور پھر چوتھی کاریں آن ٹکرائیں۔ فاسٹ لین کا ٹریفک رک گیا، مگر پہلی اور دوسری لین میں کسی نے حادثہ میں ملوث کاروں کی طرف مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ کاریں اپنے معمول کی رفتار سے بھاگتی رہیں۔ سب لوگوں کو اپنے اپنے کام کی جگہوں پر پہنچنے کی جلدی تھی۔

میں ٹکر کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے کار سے نکلا اور میں نے پشت پر کھڑی کار میں جھانک کر دیکھا، تو ڈرائیور عورت کو خون میں لت پت پایا۔ شاید اس نے سیفٹی بیلٹ نہیں باندھ رکھی تھی۔ اس کا سر ونڈ اسکرین سے جا ٹکرایا تھا۔ اور ٹکر اتنی شدید تھی کہ ونڈ اسکرین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ میں نے بھاگ کر کار کا دروازہ کھولا اور زخمی عورت کو، جو اسٹیرنگ ویل پر جھکی ہوئی پڑی تھی، سنبھال کر ڈرائیور

کی سیٹ پر سیدھا بٹھا دیا۔عورت ہوش میں تھی۔ میں نے اسے اطمینان دلایا کہ پولیس اور ایمرجنسی کار کو اطلاع کی جارہی ہے اور دونوں کسی بھی لمحے جائے وقوعہ پر پہنچنے والے ہیں۔

دس پندرہ منٹوں کے اندر اندر عورت کو فرسٹ ایڈ دینے کے بعد ہسپتال بھیجا جا چکا تھا اور اس کی کار کو جائے وقوعہ سے لے جانے کے لئے ایک قریبی گیراج کا مکینک پہنچ چکا تھا۔ حادثہ میں ملوث کاروں کے ڈرائیور ایک دوسرے کو اپنے اپنے کوائف دینے اور پولیس کی رپورٹ کے نوٹس تیار ہو جانے کے بعد اپنے اپنے راستوں پر روانہ ہو گئے۔ ہر کوئی جلدی میں تھا۔

میں دفتر پہنچا، تو پتہ چلا کہ میٹنگ اگلے روز پر ملتوی کر دی گئی تھی۔ یوں بھی میں اس روز کسی میٹنگ میں جا کر بیٹھنے کے قابل نہ تھا۔ میرے سر میں حادثے کا نظارہ گھوم رہا تھا، کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ عورت کا سر پھوٹ گیا تھا اور خون دھاروں میں بہہ رہا تھا۔ پتہ نہیں زخم کتنا گہرا تھا۔ جائے وقوعہ پر معاینہ کرنے والے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ چوٹ زیادہ شدید نہیں ہے۔ مگر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ چوٹ کے نتیجے میں مغز کے اپنی جگہ سے ہل جانے کا ہمیشہ خطرہ ہوتا ہے، جس کا اثر بہت دور رس ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی تشخیص فوری طور پر نہیں ہو سکتی۔ عام طور سے اس چیز کا پتہ کچھ وقت گذرنے کے بعد چلتا ہے۔ بعض اوقات دوسرے یا تیسرے روز جا کر چوٹ کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

میں اس حادثہ کے سلسلے میں بے قصور تھا۔ ہمیشہ پیچھے سے ٹکر مارنے والے سے پوچھا جاتا ہے کہ اس نے کیوں اگلی کار سے سیفٹی کی خاطر اتنا فاصلہ نہ رکھا تھا کہ ایمرجنسی کی صورت میں کار کو روک سکتا۔ زیادہ سے زیادہ میری کار سے آگے والی کار کے ڈرائیور سے پوچھا جائے گا کہ وہ کیوں سڑک کے بیچوں بیچ بائیں ہاتھ پر مڑنا چاہتا تھا، جب کہ اس جگہ پر درمیانی لائن کو کراس کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس طرح اس نے غلط جگہ پر کار کو اچانک روک کر رکاوٹ پیدا کی تھی، جو پیچھے چلنے والی کاروں کے لئے غیر متوقع تھی۔ بہر صورت مجھے یقین تھا کہ میرا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے۔ یوں بھی میری کار اگلی کار سے نہیں ٹکرائی تھی۔ صرف مجھ سے پیچھے آنے والی کاریں حادثے میں ملوث ہوئی تھیں۔ البتہ اس عورت کے سوا کوئی دوسرا زخمی نہیں ہوا تھا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ میں حادثے کا ذمہ دار تو نہیں ہوں، تاہم انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ زخمی عورت کی حالت کے بارے میں پوچھا جائے اور اگر ضروری ہو، تو اس کی مدد کی خاطر اپنی خدمات پیش کی جائیں۔ میں نے متعلقہ پولیس اسٹیشن پر فون کر کے اور حادثے میں ملوث ہونے کا حوالہ دے

کر پتہ چلا لیا کہ زخمی عورت کو کس ہسپتال میں لے جایا گیا تھا۔ مگر ہسپتال میں نرس یا ڈاکٹر فون پر مریضہ کے بارے میں کچھ بتانے کے لئے تیار نہ تھے۔ عام طور سے اس بارے میں ٹیلی فون پر کسی قسم کی معلومات دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ "میں خود بھی اس حادثے میں ملوث تھا"۔ یہ دعویٰ تو کوئی شخص بھی کر سکتا ہے۔ البتہ اگر مریضہ اس امر کی اجازت دے، تو میں اسے ہسپتال میں دیکھنے کے لئے آ سکتا ہوں۔ اس بارے میں نرس نے مریضہ سے بات کی، تو اس نے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ ایک شخص، جو حادثے میں ملوث تھا، اسے دیکھنے کے لئے آنا چاہتا تھا۔

میں پانچ بجے دفتر سے اٹھنے کے بعد سیدھا ہسپتال گیا۔ راستے میں زخمی عورت کو پیش کرنے کے لئے پھولوں کا ایک گلدستہ خریدا۔ مجھے پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ اس کی عمر کیا ہے۔ بلکہ اس کی شکل و صورت کے بارے میں بھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ دراصل میں نے اسے خون میں نہائے ہوئے دیکھا تھا۔ کپڑے تک خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس کو اسٹیرنگ ویل سے تھام کر سیٹ پر بٹھاتے ہوئے البتہ میں نے یہ احتیاط ضرور برتی تھی کہ اس کا خون میرے ہاتھوں پر نہ لگے۔ ایڈز کے زمانے میں یہ احتیاط بہت ضروری ہے۔ اس غرض کے لئے یورپ میں ہر کار میں فرسٹ ایڈ کی کٹ ہوتی ہے، جس میں پلاسٹک کے دستانے بھی شامل ہیں، تاکہ فرسٹ ایڈ دینے والا ان کو پہن کر زخمی ہونے والوں کے خون سے اپنا بچاؤ کر سکے۔ جب میں حادثہ ہونے کے بعد اپنی کار سے اترا، تو مجھے یہ بات بالکل نہ سوجھی تھی کہ زخمی عورت کو تھامنے سے پہلے مجھے پلاسٹک کے دستانے پہن لینے چاہئیں۔ یوں بھی فرسٹ ایڈ کی کٹ کار کی پچھلی ڈگی میں رکھی ہوئی تھی، جس کا لاک ٹکر لگنے کے سبب اس قابل نہ رہا تھا کہ کھولا جا سکتا۔ مگر اس بات کا علم مجھے بعد میں دفتر پہنچنے پر ہوا تھا، جب میں نے ڈگی میں سے اپنا بیگ نکالنے کی خاطر لاک کو کھولنا چاہا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ اچھی خاصی کشتی لڑنی پڑی تھی، تب کہیں جا کر اس کو کھولنے میں کامیابی ہوئی تھی۔

مریضہ کے سر کے گرد سفید پٹی بندھی ہوئی تھی، جس کے سبب اس کے چہرے کا ایک حصہ چھپ گیا تھا۔ البتہ اس کی خوبصورت نیلی آنکھیں، جو میں صبح دیکھ چکا تھا، اب مجھے مزید گہری اور پراسرار لگیں۔ اس نے پھولوں کا گلدستہ قبول کرتے ہوئے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا، تو میں نے دیکھا کہ وہ شادی کی انگوٹھی سے عاری تھا۔ میں نے نظر بچا کر بائیں ہاتھ کی طرف دیکھا کہ شاید اس پر منگنی کی انگوٹھی نظر آ جائے۔ مگر اس ہاتھ کی انگلیاں بھی ہر قسم کی انگوٹھیوں کے بغیر تھیں۔ میں نے پوچھا

کہ کیا اس کے گھر والوں کو حادثے کی اطلاع مل گئی تھی اور ان میں سے کوئی اسے دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ حادثے میں ملوث ہونے والوں میں سے بھی میں واحد شخص تھا، جس نے فون پر اس کے بارے میں پوچھا تھا اور اب اس کو دیکھنے کے لئے آیا تھا۔

اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کی کار کو کس قدر نقصان پہنچا تھا۔ اس بارے میں اس کو آئندہ دنوں میں انشورنس کمپنی کی طرف سے اطلاع دی جائے گی۔ البتہ اسے خطرہ تھا کہ سیفٹی بیلٹ نہ باندھنے کی وجہ سے اس کو ہسپتال کے اخراجات کا ایک حصہ خود اٹھانا پڑے گا۔ مگر اس چیز سے زیادہ اسے ایک اور فکر لگی ہوئی تھی۔ اس کے گھر پر اس کی پالتو بلی تھی، جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ صبح گھر سے چلتے ہوئے اس نے بلی کو شاپی گوشت کھلایا تھا اور اس کے پینے کے لئے پانی بھی رکھ دیا تھا۔ مگر ہسپتال میں ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ وہ ہفتہ عشرہ سے پہلے گھر واپس نہ جا سکے گی۔ اتنے دنوں تک اس کی بلی کا گزارہ کیسے ہو گا؟

"کیا آپ کے رشتہ داروں میں سے کسی کے سپرد یہ کام نہیں کیا جا سکتا؟"

"میرا اس شہر میں کوئی رشتہ دار نہیں رہتا۔ یوں بھی میں کسی رشتہ دار سے واقف نہیں ہوں"۔

"کیا آپ کے ہمسایوں میں سے کسی کے پاس فلیٹ کی چابی ہے، جس کو ٹیلی فون پر کہا جا سکے کہ وہ آپ کی غیر حاضری میں بلی کی دیکھ بھال کرے"۔

"مجھے اس فلیٹ میں منتقل ہوئے ابھی ایک ماہ ہوا ہے اور ہمسایوں کے ساتھ سرسری علیک سلیک سے بڑھ کر اب تک بات نہیں ہوئی۔ میں پوری بلڈنگ میں کسی کو نہیں جانتی ہوں۔ اس لئے اپنے فلیٹ کی چابی کسی کو دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا"۔

"بلڈنگ کا چوکیدار یا پولیس اس معاملے میں مدد دے سکتے ہیں" ۔

"چوکیدار کے ساتھ میرا اب تک واسطہ نہیں پڑا، اس لئے مجھے پتہ نہیں کہ وہ کیسا شخص ہے۔ اور پولیس زیادہ سے زیادہ یہ کرے گی کہ بلی کو جانوروں کی اسائیلم میں پہنچا دے گی۔ پھر کون جانتا ہے کہ مجھے میری پیاری بلی واپس مل سکے گی یا نہیں"۔

"پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"آپ کو دیوتاؤں نے میری مدد کے لئے بھیجا ہے۔ کیا میں آپ سے یہ درخواست کر سکتی ہوں کہ میرے فلیٹ کی چابی لے جائیں اور جا کر بلی کو دیکھ آئیں؟"

"مجھے بلیوں کی دیکھ بھال کا قطعاً کوئی تجربہ نہیں ہے۔اور پھر مجھے یہ خطرہ بھی ہے کہ آپ کے ہمسائے مجھے چور نہ سمجھ لیں۔ مجھے ان میں سے کسی نے کبھی وہاں پر آتے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ آپ مجھے بالکل نہیں جانتی ہیں۔میں نے اگر کوئی چیز ادھر ادھر کر دی،تو آپ پچھتائیں گی"۔

"میرے فلیٹ میں کوئی قیمتی چیز موجود نہیں ہے۔میں آپ پر اس لئے بھی اعتبار کرتی ہوں کہ پولیس کے پاس آپ کا اتا پتا محفوظ ہے۔آپ گڑبڑ کر کے بھاگ نہیں سکتے"۔

اب میرے لئے انکار کرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی۔مگر اس وقت تک مجھے یہ بات بالکل نہ سوجھی تھی کہ جب تک ماریا ہسپتال میں رہے گی، مجھے بلی کی دیکھ بھال کی خاطر ہر روز اس کے فلیٹ پر جانا پڑے گا۔اس طرح بیٹھے بٹھائے ایک زائد ڈیوٹی میرے ذمہ لگ رہی تھی۔

ماریا نے چلتے وقت مجھے اپنے فلیٹ کی چابیاں دیتے ہوئے کہا کہ اس کے لیٹر بکس میں اگر ڈاک آئی پڑی ہو،تو نکال کر اگلے روز لیتا آؤں۔

"لونگ روم میں رکھے ہوئے سائیڈ بورڈ پر میرا رائٹنگ پیڈ اور لفافے پڑے ہیں، وہ بھی آپ ساتھ لیتے آئیں،تو میں آنے والی ڈاک کا یہاں سے جواب لکھ سکوں گی"۔

گویا مجھے نہ صرف بلی کی دیکھ بھال کرنی ہوگی، بلکہ ماریا کی ڈاک پہنچانے کے لئے اس کی خدمت میں ہر روز حاضری بھی دینی ہوگی۔میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی خوب رہی۔مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔جو کوئی الف کہتا ہے،اس کو ب بھی کہنا پڑتا ہے۔

ماریا کا فلیٹ ایک آٹھ منزلہ ماڈرن بلڈنگ میں سب سے اوپر والی منزل پر لفٹ کے دروازے کے بالمقابل تھا۔ مجھے لفٹ میں یا اوپر پہنچ کر دروازہ کھولتے ہوئے ماریا کا کوئی ہمسایہ نہ ملا۔اس کے دروازے پر لگی ہوئی پلیٹ پر اس کا نام لکھا ہوا تھا: کوسلوفسکی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ پولش نام لگتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ یہ اس کے خاوند کا نام ہو یا شاید اس کے باپ کا۔جرمنی میں لاکھوں انسانوں کے نام پولش یا چیک ہیں، کیونکہ سابقہ وقتوں میں ان علاقوں میں اچھی خاصی جرمن آبادی پائی جاتی تھی، جس کو پہلی اور دوسرے جنگ عظیم کے بعد وہاں سے ہجرت کرنا پڑی تھی۔

فلیٹ کا دروازہ کھلتے ہی ماریا کی بلی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی میرے استقبال کی خاطر دوڑی ہوئی آئی۔کتا ہوتا تو یقیناً ایک اجنبی کو دیکھ کر بھونکتا اور شاید حملہ آور ہوتا۔مگر بلی اس طرح میرے قدموں

میں لوٹ پوٹ رہی تھی، جیسے وہ مجھے ہمیشہ سے جانتی ہو۔

فلیٹ دو کمروں اور ایک کوریڈور پر مشتمل تھا۔ دائیں ہاتھ پر لونگ روم تھا اور بائیں طرف سونے کا کمرہ اور باتھ روم۔ باورچی خانہ بے حد مختصر تھا اور لمبائی چوڑائی میں کوریڈور جتنا تھا۔ اس میں بس اتنی گنجائش تھی کہ ایک شخص کھڑا ہو کر کھانے پکانے کا کام کر سکے۔ گویا فلیٹ میں ایک یا دو سے زیادہ لوگوں کی رہائش کے لئے جگہ موجود نہ تھی۔ البتہ مجھے وہاں پر مقیم کسی دوسرے شخص کے آثار دکھائی نہ دیئے۔ فرنیچر مختصر مگر نیا تھا، جیسا کہ عام طور سے چھڑے چھانٹ لوگوں کے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ گنتی کی چند کتابیں، ٹیلی ویژن سیٹ اور فون۔ کسی قسم کی لگژری کا سامان وہاں پر موجود نہ تھا۔ لونگ روم کے سامنے پوری چوڑائی میں ایک بالکنی تھی، جس پر دو کرسیاں پڑی تھیں اور ایک میز دھرا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے بڑے خوشنما ڈیزائن کے تھے اور بالکل نئے نکور۔ گویا ماریا کی بات درست تھی کہ اس کو اس فلیٹ میں منتقل ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے۔ کمرے میں صرف ایک میز تھا، جو شاید لکھنے پڑھنے کے علاوہ ڈائننگ ٹیبل کے کام بھی آتا تھا۔ سائیڈ بورڈ پر ماریا کا رائیٹنگ پیڈ اور لفافے رکھے ہوئے تھے، جن کو اس نے ساتھ لانے کی فرمائش کی تھی اور کہا تھا کہ لیٹر بکس میں سے اس کے نام آئی ہوئی ڈاک بھی نکال کر لیتا آؤں۔ میں نے کوریڈور میں کھلنے والے دروازے پر نگاہ ڈالی، تو دیکھا کہ وہاں پر خط پتر ڈالنے کے لئے ایک چوڑا سوراخ تو موجود ہے، مگر دروازے پر لیٹر بکس نہیں لگایا گیا۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ میں نے بلڈنگ میں داخل ہوتے وقت دروازے کے پہلو میں پوری بلڈنگ کے باسیوں کے قطار وار لگے ہوئے لیٹر بکس دیکھے تھے۔ مجھے بلڈنگ کو چھوڑنے سے پہلے ماریا کے لیٹر بکس میں سے اس کی ڈاک نکالنی نہیں بھولنی چاہیئے۔

پورے فلیٹ میں کسی قسم کی ڈیکوریشن موجود نہ تھی۔ وگرنہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ دیواروں پر پینٹنگز اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کی فوٹوز لگاتے ہیں۔ بالخصوص عورتیں اس بارے میں بہت اچھے ذوق کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ماریا کے ہاں یہ ضرور تھا کہ فرنیچر کے گدے اور کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے پردے میچنگ کلر کے تھے۔ کمرے کی واحد الماری، جس میں چینی کے برتن، وائن اور بیئر کے لئے استعمال ہونے والے گلاس، کھانے کے لئے چھری کانٹے اور دو چار کتابیں رکھی ہوئی تھیں، بہت سادہ تھی، جیسی عام طور سے ان گھروں میں دیکھنے میں آتی ہے، جہاں پر روپے پیسے کی بھرمار نہیں ہوتی۔ مگر یہ بھی نہیں تھا کہ اس کو کباڑ میں خریدا گیا ہو۔ ہر چیز سادہ تھی، مگر صاف ستھری۔

ماریا کی بلی قدم قدم پر سارے فلیٹ میں میرے ساتھ ساتھ رہی، جیسے اسے خطرہ ہو کہ میں کہیں اس کو اکیلا چھوڑ کر چلا نہ جاؤں۔ اس کے بول و براز کو صاف کرنے اور اس کو کھانے کے لئے شاپی گوشت دینے اور پینے کے لئے پانی کا کٹورہ دھرنے کے بعد میں چپکے سے فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ جب میں باہر سے تالا لگا رہا تھا، تو میں نے بلی کی میاؤں دروازے کے پیچھے سے سنی۔ چلتے ہوئے میں نے بیگ میں ماریا کا رائٹنگ پیڈ اور لفافے ڈال لئے تھے، جنکو مجھے اگلے روز ہسپتال میں پہنچانا تھا۔ نیچے اتر کر بلڈنگ کو چھوڑنے سے پہلے میں نے ماریا کے لیٹر بکس سے اس روز کی ڈاک بھی نکال کر محفوظ کر لی۔

اگلے روز دفتر سے اٹھ کر میں سیدھا ماریا کے ہسپتال میں گیا، جو بے چینی کے ساتھ میری آمد کی راہ تک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو ڈاک میں آئے ہوئے خط پڑھنے کی جلدی تھی، جن کو اس نے میری موجودگی میں ہی کھول کر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ پانچوں خط میونخ سے ری ڈائرکٹ ہو کر آئے تھے۔ مجھے اتنے خط سالگرہ کے دن بھی نہیں آتے۔ ہوسکتا ہے کہ اس روز اس کی سالگرہ ہو، میں نے دل میں سوچا۔ مجھے پتہ تھا کہ مجھے اس بارے میں اس سے کوئی سوال نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ اس کا قطعاً ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے اس چیز سے بھلا کیا غرض ہوسکتی ہے کہ کس کو کتنے خط آتے ہیں۔ مگر یہ بھی کیا ہوا کہ ماریا میری موجودگی میں خط پڑھنے لگ گئی تھی۔ وہ میرے جانے کا انتظار بھی تو کر سکتی تھی۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں جاؤں، تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ خطوط کا مطالعہ کر سکے۔

پھر جب میں جانے کے لئے اٹھا، تو اس نے مجھے روک لیا۔ اس نے کہا کہ میں نے اسے بلی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں نے جواب دیا کہ بلی نے اسے سلام بھیجا تھا اور اس کی خیر خیریت پوچھی تھی۔ اپنے بارے میں اس نے کہا تھا کہ وہ خوب مزے میں ہے۔

"اچھا، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ کو بلی کی زبان آتی ہے"۔ ماریا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"زبان تو خیر مجھے نہیں آتی۔ مگر اس کی میاؤں سے میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا"۔

ماریا نے معذرت چاہی کہ اس نے خواہ مخواہ مجھے تکلیف دی تھی۔ دراصل اس کا ہمبرگ میں کوئی رشتہ دار یا واقف کار نہیں رہتا۔ وہ ہمبرگ آنے سے پہلے میونخ میں رہتی تھی۔ وہاں پر اس کے جاننے والے بہت تھے۔ ہمبرگ میں میرا وجود اس کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا۔ اگر میں نہ آتا، تو اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس کو اپنی بلی کی دیکھ بھال کے لئے کہتی۔ میں نے کہا کہ سنگل لوگوں کو بلیاں، کتے اور دوسرے پالتو جانور نہیں رکھنے چاہیئں۔

"مجھے سنگل ہوئے زیادہ لمبا عرصہ نہیں ہوا، اس لئے مجھے ان باتوں کی خبر نہیں"۔

"تجربے سے انسان سب کچھ سیکھ جاتا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"میں اتنے لمبے عرصے تک شادی شدہ تھی کہ چھڑے چھانٹ زندگی گزارنے کے سب آداب بھول چکی ہوں"۔

"کیا مطلب۔ اب آپ شادی شدہ نہیں ہیں؟"

"ابھی حال میں ہی میری طلاق ہوئی ہے"۔

"مجھے اس بارے میں کچھ پوچھنے کا حق نہیں ہے۔ اس لئے میں یہ بات آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ مجھے کچھ بتانا چاہتی ہیں یا نہیں"۔

"اہم ترین بات تو میں بتا چکی ہوں کہ میں اپنے خاوند سے طلاق لے چکی ہوں۔ اس کی وجہ بس اتنی ہے کہ وہ ایک بچے کا باپ بن گیا ہے، جس کو میں نے نہیں میری سہیلی نے جنا ہے۔ مجھے بالکل پتہ نہ تھا کہ ان کے درمیان جنسی رشتہ قائم ہے۔ دونوں کامیابی کے ساتھ ایک ناٹک کھیلتے رہے ہیں۔ میرے دل میں ایک منٹ کے لئے بھی یہ شبہ پیدا نہ ہوا تھا۔ میں دو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھی تھی۔ مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔ میں ان کے راستے سے نکل گئی ہوں، تاکہ وہ اپنے بچے کے ساتھ بھرپور فیملی لائف گزار سکیں"۔

"کیا آپ کے بچے نہیں ہیں؟"

"نہیں۔ ہم نے شروع سے ایک دوسرے کے ساتھ طے کرلیا تھا کہ ہم بچے پیدا نہیں ہونے دیں گے۔ فیرڈینینڈ، یہ میرے سابقہ خاوند کا نام ہے، کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ اس نے میرا دل رکھنے کے لئے یہ شرط مان لی تھی۔ اسے بچے بہت پسند ہیں۔ پسند تو میں بھی کرتی ہوں، مگر میری اپنی زندگی کی کہانی ایسی ہے کہ میں اپنے سائے پر سے نہیں پھلانگ سکتی"۔

"آپ کی بات میرے پلے نہیں پڑی۔ بالخصوص سائے پر سے پھلانگنے والی"۔

"مجھے پتہ ہے کہ میری بات کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ دراصل میری ماں نے میری پیدائش کے فوراً بعد مجھے غیر لوگوں کو دے دیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنا متبنیٰ بنالیا تھا اور میری پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مگر میرے دل میں چھبا ہوا کانٹا کہ میری ماں نے مجھے رد کردیا تھا، مجھے چین نہیں لینا دیتا"۔

"آپ اپنے بچوں کے ساتھ مختلف سلوک کرسکتی تھیں"۔

"جب تک مجھے پتہ نہیں چل جاتا کہ میری ماں نے مجھے کیوں غیر لوگوں کو دے دیا تھا، اس وقت تک میں ماں نہیں بن سکتی۔ جب سے میں فیرڈینینڈ سے علیحدہ ہوئی ہوں، اس وقت سے میں اپنی ماں کی تلاش میں ہوں۔ میں اس سے یہی بات پوچھنا چاہتی ہوں"۔

"میں نے دیکھا ہے کہ آپ کے نام آنے والے خطوط جرمنی کے پانچ مختلف شہروں سے آئے ہیں، مگر ان کے لکھنے والوں کے فیملی نام آپ کی طرح کوسلوفسکی ہیں۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ یہ خطوط آپ کے رشتہ داروں کی طرف سے ہیں۔ کیا کوسلوفسکی کا نام آپ کو خاوند کی طرف سے ملا تھا یا اس فیملی کی طرف سے، جس نے آپ کو متبنیٰ بنایا تھا؟"۔

"نہیں، یہ نام میرے برتھ سرٹیفکیٹ پر درج ہے۔ جس پر ماں کا نام تو موجود ہے مگر باپ کے بارے میں "نامعلوم" لکھا ہوا ہے۔ شاید میری ماں شادی شدہ نہیں تھی۔ اور کوسلوفسکی اس کا فیملی نام تھا۔ میں نے طلاق لینے کے بعد متعلقہ آفس کی اجازت سے ماں کا فیملی نام اختیار کیا ہے"۔

"آپ ماں کو کیسے تلاش کر پائیں گی؟ اس کو ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی کا تلاش کرنا ہے۔ جب کہ شاید آپ یہ بھی نہیں جانتی ہیں کہ وہ کہاں کی رہنے والی تھی"۔

"دراصل جب میں نے ماں کو ڈھونڈنا شروع کیا، تو مجھے پتہ نہیں چلتا تھا کہ تلاش کو کہاں سے شروع کروں۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے بعد میں شادی کر لی ہو اور ملکی رواج کے مطابق اپنے خاوند کا فیملی نام اختیار کر لیا ہو۔ اس کے باوجود میں نے سوچا کہ شاید ماں کے بھائی یا دوسرے مرد رشتہ دار موجود ہوں، جو مجھے اس کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔ اس لئے میں نے ملک بھر کی ٹیلی فون ڈائرکٹریوں میں سے کوسلوفسکی نام رکھنے والوں کی فہرست بنا کر ان کے پتے نوٹ کر لئے۔ ان کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ تھی۔ میں نے ان کو خط لکھ کر پوچھنا شروع کر رکھا ہے کہ کیا ان میں سے کوئی میری ماں مارگاریتا کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے مجھے ہر روز اپنی آمدہ ڈاک کو دیکھنے کی بے قراری رہتی ہے"۔

"آپ کو اس سلسلے میں اس سرکاری محکمہ سے بھی پوچھنا چاہیئے، جو خاندانی ریکارڈ رکھتا ہے"۔

"میں پوچھ چکی ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے کاغذات میں ماں کا کوئی اندراج نہیں ہے۔ دراصل میری پیدائش ایک ایسے مقام کی ہے، جو آج کل پولینڈ میں ہے۔ وہاں پر رکھے جانے والے ریکارڈ جنگ میں تلف ہو گئے تھے"۔

"ریڈ کراس کا ریکارڈ کیا کہتا ہے؟"

"میں ان سے پوچھ چکی ہوں۔ بلکہ اس محکمہ کے پاس بھی میری درخواست پڑی ہے، جو ہر روز ریڈیو پر گم شدہ لوگوں کے بارے میں معلومات مہیا کرنے کے لئے اپیل کرتا اور نام نشر کرتا ہے"۔

میں روزانہ ماریا کے لیٹر بکس میں سے اس کے خط نکال کر لاتا رہا، جو عام طور سے اس عبارت پر مشتمل ہوتے تھے کہ لکھنے والے کے خاندان میں کوئی عورت اس نام کی نہیں پائی جاتی۔ پانچویں یا چھٹے روز ایک شخص نے اپنے خط میں اطلاع دی تھی کہ اس کی بڑی بہن کا یہی نام تھا۔ مگر وہ جنگ کے آخری دنوں میں روسی فوج کے حملے کے دوران اپنے خاندان سے بچھڑ گئی تھی۔ اس کے بارے میں انہیں کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ زندہ بچ نکلی تھی یا ماری گئی تھی۔ اس نے درخواست کی تھی کہ اگر ماریا کو اتفاقی طور پر اس کی بہن کے بارے میں کچھ پتہ چل سکے، تو اسے بھی اطلاع کر دے۔

اس دوران میں میری دلچسپی اس کام میں اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں نے اپنے طور پر تلاش شروع کر دی تھی۔ ماریا نے بتایا تھا کہ اس کو متبنیٰ بنانے والی فیملی کو جنگ کے خاتمے پر جب ایک لڑکی کی پیش کش ہوئی، تو وہ اس زمانے میں ہمبرگ کے ایک مضافاتی گاؤں میں مقیم تھی۔ میرا قیاس تھا کہ اس مقام پر چرچ کے ریکارڈ میں اس چیز کا اندراج ہونا چاہیئے۔ چرچ کی انتظامیہ سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ نہ صرف وہاں کا چرچ، بلکہ آس پاس کے دوسرے کئی دیہات کے گرجا گھر عرصہ ہوا بند کئے جا چکے ہیں۔ البتہ ان کے ریکارڈ کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ ایک مرکزی چرچ میں محفوظ ہے اور دیکھا جا سکتا ہے۔

آٹھویں روز ماریا کو ہسپتال سے گھر واپس جانے کی اجازت ملی، تو ہم وہاں سے سیدھے اس مرکزی چرچ میں پہنچے۔ پادری نے ماریا کی داستان سننے کے بعد متعلقہ چرچ کے ریکارڈ کو دیکھنے کی اجازت دی۔ اس کے آفس کی ایک عورت نے اس گاؤں کا رجسٹر نکال کر ہماری موجودگی میں اس کی پڑتال کی۔ ۱۹۴۷ء کے تحت مارگریتا کو سلوفسکی کے نام کا اندراج مل گیا، جس کی شادی ہمسایہ گاؤں کے ایک زمیندار ہائنریش مولر کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس دوران میں اس کا خاوند مر گیا تھا۔ مگر مارگریتا حیات تھی۔ اس کے تین بچے تھے، جن میں سے ایک بدستور اسی گاؤں میں آباد تھا۔ ماں اسی کے پاس رہتی تھی۔

پادری نے ماریا کو مشورہ دیا کہ ماں کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے بعد اسے ملنے کے لئے جائے۔ اس کا بہتر طریق یہ ہوگا کہ ماریا اس کو فون کرے اور باتوں باتوں میں اپنے ملنے کی خواہش سے آگاہ کرے۔ کون جانتا ہے کہ ماں کو اس خبر سے خوشی ہوگی یا نہیں کہ اس کی بیٹی، جس کو اس نے دوسرے

لوگوں کر دے دیا تھا، اس سے ملنا چاہتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے ضمیر نے اس لمبے وقفے کے دوران اس کو اتنی بار ملامت کی ہو کہ وہ بیٹی کا سامنا کرنے کی سکت نہ رکھتی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ جنگ کے بعد اکیلی دکیلی عورتوں کے لئے بچوں کا پالنا بے حد دشوار تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ماریا کی ماں نے اپنی بیٹی کے مستقبل کی خاطر اس کو ایک ایسے خاندان کے حوالے کر دیا تھا، جو اس کے مقابلے میں معاشی طور پر بہتر حیثیت رکھتا تھا۔

ماریا نے فون کیا، تو ماں نے خود ریسیور اٹھایا اور پوچھا کہ کون بول رہا ہے؟

"ماریا" ماریا نے جواب دیا۔

" کون ماریا؟ کیا میری بیٹی ماریا؟"

"جی ماں، تمہاری بیٹی ماریا، جو تم سے ملنے کی خواہش لے کر تمہارے گاؤں میں آئی بیٹھی ہے"

"تو پھر میرے پاس کیوں نہیں آ جاتی ہو۔ میں عمر بھر سے تمہاری راہ تک رہی ہوں"۔

چند منٹوں کے بعد ماریا اور اس کی ماں ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھیں۔ خوشی کے آنسوان کی آنکھوں سے چھلک رہے تھے اور میں تھوڑے فاصلے پر کار میں بیٹھا ہوا ماں بیٹی کی غیر معمولی مماثلت پر حیران ہو رہا تھا۔

(کمرفیلڈ۔ ۲۶ دسمبر ۲۰۰۲ء)

اندریا پاشنسکی

انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے سیکرٹری کی اسامی کے لئے دیئے جانے والے اشتہار پر دس لڑکیوں کی درخواستیں آئی تھیں، جن میں سے سات سرے سے اس قابل نہ تھیں کہ ان کو انٹرویو کے لئے بلایا جاتا۔ان کی ارسال کردہ سندات اور تعارفی چھٹیاں معذرتی نوٹ کے ساتھ واپس کر دی گئیں۔شاید امیدواروں نے اشتہار میں چھپی ہوئی شرائط کو غور سے نہیں پڑھا تھا۔ وگرنہ ان کو پتہ ہوتا کہ جرمن کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور ہونا لازمی شرط تھی۔ اتنا کافی نہ تھا کہ درخواست دھندگان کو متذکرہ زبانوں کی معمولی سدھ بدھ ہو اور ٹائپنگ کرنی آتی ہو۔ باقی ماندہ تین لڑکیوں کو انٹرویو کے لئے بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ان میں سے ایک لڑکی جرمن کے علاوہ انگریزی اچھی جانتی تھی اور دوسری کو فرانسیسی آتی تھی۔ تیسری تینوں زبانیں جانتی تھی، مگر سیکرٹری شپ کی باقاعدہ تربیت یافتہ نہ تھی۔ وہ پانچ برسوں تک ایک جمنازیم میں انگریزی اور فرانسیسی کی استانی رہ چکی تھی اور یونیورسٹی کی ڈگری ہولڈر تھی۔ جب کہ دوسری دونوں لڑکیاں ہائی اسکول پاس تھیں، البتہ باقاعدہ تربیت یافتہ سیکرٹری تھیں۔مگر عمر کے اعتبار سے وہ تیسری سے، جو مجھے چیف سیکرٹری کے عہدے کے لئے زیادہ مناسب لگتی تھی، کہیں چھوٹی تھیں۔ چیف سیکرٹری کے تحت کام کرنے والے عملہ میں چونکہ پکی عمر کی عورتیں بھی شامل تھیں۔اس لئے اس کا کم عمر ہونا مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔تیسری میں بس یہ خامی تھی کہ اس کو کسی ادارے میں بطور سیکرٹری کام کرنے کا لمبا چوڑا تجربہ نہیں تھا۔ لے دے کے اس نے چند ماہ تک طالب علمی کے زمانے میں یونیورسٹی کی تعطیلات کے دوران ایک ٹریولنگ ایجنسی میں کام کیا تھا، جہاں پر اس کو ہر قسم کی خدمات بجا لانی پڑی تھیں۔ وہ ٹائپسٹ تھی اور سیکرٹری، اور اگر ضرورت پڑ جاتی تھی، تو ڈرائیور بلکہ ٹورسٹ گائیڈ بھی بن جاتی تھی۔ درخواست کے ساتھ منسلکہ تصویر ایک خوش شکل عورت کی تھی۔ مگر مجھے پتہ تھا کہ محض امیدواروں کی فائل یا تصویر دیکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کاغذ بہت صابر شئے ہے، جس پر انسان جو

چاہے لکھ سکتا ہے۔ اور تصویریں حقیقت کو آشکار کرنے کی بجائے بعض اوقات چھپانے کا کام کرتی ہیں۔

انٹرویو کے روز تینوں مقررہ وقت پر حاضر ہوئیں۔ دونوں نوجوان لڑکیوں کا معاملہ صاف تھا، کیونکہ وہ زبانوں کی شرط پر پوری نہ اترتی تھیں۔ یوں بھی نوعمری کے سبب ان کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ چیف سیکرٹری کا کام نبھا سکتیں۔ ان کے مقابلے میں اندریا پاشنسکی بھرپور شخصیت کی مالک اور اونچے قد کاٹھ اور مضبوط ہاتھ پاؤں کی خوبصورت لڑکی تھی، جس کا چلنے پھرنے کا انداز مجھے فیشن ایبل عورتوں سے زیادہ کسی اسپورٹس مین جیسا لگا۔ اس کا باتیں کرنے اور ہنسنے کا طریق بھی مجھے الگ سا محسوس ہوا۔ پتہ چلا کہ وہ ایک اسپورٹ کلب میں برسوں تک ہینڈ بال کھیلتی رہی تھی۔ مگر کچھ عرصہ سے اس نے کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر اس میں واضح طور پر آرگنائزیشن کا مادہ پایا جاتا تھا، جس کو اس نے اسکول میں پڑھانے کے دوران خوب ترقی دی تھی۔ تینوں زبانوں پر اسے میری توقع کے مطابق عبور حاصل تھا۔ وہ جرمن کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی فرفر بولتی تھی اور تینوں زبانوں میں خط و کتابت کا خوب ملکہ رکھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس معاملے میں میری سابقہ سیکرٹری سے کسی طرح پیچھے نہ تھی، جس کے جانے کا مجھے بہت افسوس تھا۔ دراصل اس کے ہاں بچہ ہونے والا تھا اور اس کے خاوند نے کہا تھا کہ اس کی بیوی کو آئندہ دس برسوں تک بچے کی پرورش و پرداخت کے لئے گھر پر رہنا ہوگا۔ اس زمانے میں ابھی حاملہ عورتوں کو دو برسوں تک حکومت کی طرف سے چائلڈ الاؤنس نہیں ملتا تھا اور نہ ہی زچگی کے وقفے کے بعد ان کو سابقہ ملازمت پر بحال کرنے کا قانون پاس ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں اب عام طور سے عورتیں اپنے سابقہ کام کی طرف لوٹنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ کیونکہ لمبے عرصے تک ملازمت سے دور رہنے کے سبب ان کو بعد میں کوئی ادارہ لینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

"آپ نے مدرسی کیوں چھوڑی ہے، جبکہ استادوں کو نہ صرف اچھی تنخواہیں دی جاتی ہیں، بلکہ ان کو سال بھر میں تین ماہ کی تعطیلات ملتی ہیں، جو آپ کو بطور سیکرٹری ملنے والی سالانہ چھٹیوں سے کہیں زیادہ ہیں"۔ میں نے جاننا چاہا۔

"دراصل اسکولوں میں بچوں کا شور شرابا ناقابل برداشت ہو چکا ہے، جس کے سبب اکثر استاد بیمار پڑ جاتے ہیں اور وقت سے پہلے پنشن لے لیتے ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔

"آپ نے پنشن کا انتظار نہیں کیا اور ابھی سے مدرسی کو خیرباد کہہ دیا ہے"۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر آپ میری جگہ پر ہوتے، تو یہی کرتے۔ دراصل بچوں میں ڈسپلن بالکل

نہیں پایا جاتا، کیونکہ ماں باپ ان کی تربیت کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اسکول میں استادوں کا واسطہ نیم وحشی طالب علموں کے ساتھ پڑتا ہے، جن کو کسی قسم کی سزا دینے کی اجازت نہیں ہے۔ بچے استادوں کے کندھوں پر چڑھ کر ناچتے اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو امتحان میں تھوڑے نمبر ملیں، تو وہ ماں باپ کو لے آتے ہیں اور نمبر بڑھانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سرکاری طور پر یوں بھی کسی طالب علم کو امتحان میں فیل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نالائق بچے پوری کلاس کی پڑھائی کی رفتار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان حالات میں استادی کا پیشہ کچھ ایسا دلفریب نہیں رہ گیا"۔

" کیا دفتر میں کام کرنا اس سے زیادہ دلفریب ہے، جہاں پر آپ کو سارا دن خچر کی طرح فائلیں ڈھونی پڑیں گی"۔ میں سچ مچ اس کو ڈرانے پر اتر آیا تھا۔

" میں چاہتی ہوں کہ جب شام کو پانچ بجے مجھے دفتر سے چھٹی ملے، تو میرے کندھوں پر کوئی بوجھ نہ ہو اور میں سکھی ہو کر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے گھر جاؤں۔ یہ احساس میں مدرسی کے دوران بالکل بھول چکی ہوں، کیونکہ استادوں کو بہت سا کام گھر پر کرنا پڑتا ہے، جس کے سبب ان کی گھریلو زندگی متاثر ہوتی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کی سابقہ ملازمت کی رپورٹ پر، جس کے بارے میں مجھے پتہ تھا کہ اس میں ایسے ریمارک دینے کی سرکاری طور پر اجازت نہیں، جو ملازمین کے خلاف جاتے ہوں، سرسری طور پر نظر ڈالنے کے بعد اس کے حق میں فیصلہ دے دیا اور انسٹی ٹیوٹ کو ہدایت کی کہ اندریا کو ملازمت دے دی جائے۔ البتہ میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ سگریٹ نوش تھی، کیونکہ اس کے دانتوں پر پیلا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ مگر یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ اس وجہ سے کسی کو ملازمت دینے سے انکار کیا جا سکتا ہو۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب سگریٹ نوشی کا معاشرے میں عام رواج تھا اور لوگ کھلے بندوں ہر جگہ پر سگریٹ سلگا لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انسٹی ٹیوٹ کی میٹنگوں میں بھی سگریٹ کی نعمت سے محروم لوگوں کو دوسروں کا دھواں برداشت کرنا پڑتا تھا، کیونکہ سگریٹ نوشوں کی انسٹی ٹیوٹ میں اکثریت تھی اور ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ جب چاہیئں اور جہاں چاہیں اپنے اور دوسروں کے پھیپھڑے سوختہ کرتے پھریں۔

میں نے انٹرویو کے دوران نوٹ کیا کہ اندریا کی آنکھوں میں بے چینی اور گھبراہٹ کی لہر تھی اور وہ مجھے عام طور سے بے حد ڈری ہوئی لگی، جیسے اسے کوئی خطرہ لاحق ہو۔ مگر اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا تھا، کیوں کہ اس چیز کا تعلق اسکی پرائیویٹ زندگی سے تھا، جس کی چھان بین میرے اختیار سے

باہر تھی۔ جب تک وہ اپنے مفوضہ کاموں کو پوری ذمہ داری سے سرانجام دیتی ہے اوران سلسلے میں کوئی کمی واقع نہیں ہونے دیتی، تب تک کسی کو اس کی بے چینی کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس کی تنخواہ مقرر کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری تھا کہ کیا وہ شادی شدہ ہے۔ مطلقہ ہونے کی صورت میں بھی اس چیز کا اثر ماہانہ تنخواہ پر پڑتا ہے۔ اندریا یوں تو شادی شدہ تھی، مگر میاں بیوی نے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور طلاق کی کاروائی جاری تھی۔ ان کے دو بچے تھے، مگر اندریا نے بچوں کے الاؤنس کے بارے میں کچھ نہ کہا، جس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بچوں کے لئے ملنے والا سرکاری الاؤنس باپ کو ملتا ہوگا۔

اگرچہ مجھے اس کی رہائش گاہ کے بارے میں پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی یہ جاننے کی کہ وہ شہر کے کس علاقے میں رہتی ہے، اس چیز کا ذکر یونہی باتوں باتوں میں آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ پانچ عورتوں کی ایک مشترکہ رہائش گاہ میں رہتی ہے، جس میں ہر کسی کے پاس اپنا اپنا علیحدہ کمرہ ہے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے مل کر ایک مکان شہر کے مضافات میں کرائے پر لے رکھا تھا۔ کرائے نامے پر پانچوں عورتوں نے دستخط کئے تھے اور سب نے مل کر ضمانت کی رقم ادا کی تھی۔ اگر ان میں سے کوئی کمیون کو چھوڑنا چاہے، تو اسے اپنا حصہ کسی اور کے پاس بیچنے کی اجازت تھی، البتہ اس پر پہلا حق کمیون کی دوسری عورتوں کا تھا۔ ان کی رضامندی کے بغیر باہر سے کوئی فرد اس مکان میں رہائش اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ بالخصوص کسی مرد کو یہ حق حاصل نہ تھا۔ البتہ کمیون کی عورتیں اپنے مرد دوستوں کو بطور مہمان تھوڑے دنوں کے لئے اپنے پاس ٹھہرا سکتی تھیں۔ ان کو مستقل طور پر رہائش کی اجازت دینے کا فیصلہ دوسری عورتوں کی رضامندی پر منحصر تھا۔

"یہ چیز اب تک پیش نہیں آئی اور امید واثق ہے کہ آئندہ بھی پیش نہیں آئے گی"۔ اندریا نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے بتایا کہ کمیون کی عورتوں نے گھر کی صفائی ستھرائی، کھانے پکانے اور کپڑے دھونے کے سلسلے میں باقاعدہ پلان بنا رکھا تھا، جس کے مطابق باری باری سب کی ڈیوٹی لگتی تھی۔ مکان کے قطعہ زمین کا باغ بہت وسیع وعریض تھا، جس میں سبزیاں بھی اگائی جاتی تھیں۔ کئی ایک پھل دار پودے باغ میں لگے ہوئے تھے، جن کی دیکھ بھال میں سب برابر کی حصہ دار تھیں۔ کمیون کے پاس دو موٹر کاریں تھیں، جو سب کی سانجھی تھیں اور شہر میں مقررہ جگہوں پر پارک کی جاتی تھیں، جہاں سے شام کے وقت واپسی کے اوقات معین تھے۔ وہاں پر دیر سے آنے والیوں کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ بات اس نے اس لئے بتائی تھی کہ وہ پانچ بجے کے بعد انسٹی ٹیوٹ میں ٹھہرنے اور اوورٹائم کام کرنے سے

قاصر تھی۔ کار نکل جائے ،تو اسے گھر جانے کے لئے ریل گاڑی لینی پڑتی تھی ،جس کے سبب گھر کے راستے پر دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔

چونکہ میری سیکرٹری اسی ماہ کے اختتام پر انسٹی ٹیوٹ چھوڑ رہی تھی ،اس لئے یہ امر بھی ہمارے لئے غیر اہم نہ تھا کہ اندریا فوری طور پر کام شروع کر سکتی تھی۔ اسکول میں ان دنوں چھٹیاں تھیں ،جن کے اختتام پر اس کی ملازمت ختم ہو رہی تھی ،اس لئے اندریا فوری طور پر آزاد تھی۔ اس نے خود ہی تجویز پیش کی کہ اگر میں چاہوں ،تو وہ اپنی تقرری سے پہلے چند روز تک میری سیکرٹری کے ساتھ مل کر کام کر سکتی ہے، تا کہ اسے بعد میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

میری سیکرٹری کو اندریا بہت پسند آئی۔ دونوں کی طبیعتیں ملتی جلتی تھیں اور ان کا کام کرنے کا طریق بھی ایک جیسا تھا۔ البتہ اس نے مجھے علیحدگی میں کہا کہ اندریا دوسری عورتوں سے بہت مختلف ہے۔ اسے یہ چیز بالکل پسند نہیں ہے کہ اسے کافی بنانے کے لئے کہا جائے۔ عام طور سے سیکرٹری کو دفتر میں آنے والے مہمانوں کی خاطر داری کرنا ہوتی ہے اور افسر اعلیٰ کے لئے چائے پانی کا انتظام اس کے ذمے ہوتا ہے۔

" کیا آپ جانتے ہیں کہ اندریا چین اسموکر ہے"۔ اس نے ہولے سے کہا۔ اس کو پتہ تھا کہ میں سگریٹ کے دھویں سے الرجک ہوں اور حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔

" جب تک وہ میرے کمرے میں سگریٹ سلگانے سے باز رہتی ہے، اسے سگریٹ نوشی سے روکنا میرے بس سے باہر ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ " ہر کسی کو حق حاصل ہے کہ اپنی صحت کا خیال رکھے یا اسے برباد کرتا پھرے"۔

پہلے مہینے میں ہی مجھ تک یہ بات پہنچی کہ اندریا نہ صرف سگریٹ نوشی کی رسیا ہے، بلکہ شراب، بالخصوص بیئر، پینے میں بھی ریکارڈ ہولڈر لگتی ہے۔ جرمن معاشرے میں یہ چیز قابل معافی سمجھی جاتی ہے، کیونکہ لوگوں کی اکثریت اس لت کا شکار ہے۔ میں نے کہا کہ جب تک اس چیز کا اثر اس کے کام پر نہیں پڑتا، اس کو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اتفاقی طور پر انہی دنوں میں میرے ڈپارٹمنٹ کے ایک کارکن کی پچاسویں سالگرہ آ گئی ،جس کو وہ بڑے پیمانے پر منانا چاہتا تھا۔ میں تو خیر آدھ پون گھنٹہ ٹھہرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا، کیونکہ مجھے ایک میٹنگ میں شرکت کے لئے سفر پر جانا تھا۔ وہاں سے چوتھے روز واپسی پر میں نے سنا کہ اس روز اتنی شراب پی گئی کہ بعض کارکن میزوں تلے پڑے ہوئے پائے گئے۔ اندریا

کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ دو روز تک بیماری کے سبب کام پر حاضر نہ ہو سکی تھی۔

یہ چیز ایسی نہیں تھی کہ اندریا سے باز پرس کی جاتی۔ عورتوں کے ساتھ کام کرنے والوں کو پتہ ہے کہ وہ بعض اوقات ماہواری آ جانے کے سبب یا کسی دوسری زنانہ بیماری کی وجہ سے کام پر حاضر نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے میں نے اس چیز کو اہمیت نہ دی۔ پھر میں نے اندریا کو فون پر کسی کو بتاتے ہوئے سنا کہ اس روز مچھلی کھانے کے سبب اس کا معدہ خراب ہو گیا تھا اور اسے دو روز تک آرام کرنا پڑا تھا۔ گویا معاملہ بیماری کا تھا اور قابل درگذر تھا۔

تھوڑے دنوں کے بعد اندریا اطلاع دیئے بغیر کام پر حاضر نہ ہوئی۔ عام طور سے اتنا کافی ہوتا ہے کہ گھر سے فون پر بتا دیا جائے کہ کارکن کی طبیعت ناساز ہے اور وہ کام پر نہیں آ سکتا۔ تین روز تک بیماری کی چھٹی حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر کے پاس جانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ بیماری تین دن سے زیادہ لمبی ہو جائے، تو طبی سرٹیفکیٹ پیش کرنا پڑتا ہے۔ اندریا چوتھے روز کام پر حاضر ہو گئی اور اس نے معذرت چاہی کہ اس کے کمیون کی ایک لڑکی کو انسٹی ٹیوٹ میں فون کرنے کے لئے کہا گیا تھا، مگر وہ فون کرنا بھول گئی تھی۔ چونکہ یہ امر پہلی بار پیش آیا تھا، اس لئے معاملہ رفع دفع کر دیا گیا اور اندریا کو زبانی طور پر آئندہ محتاط رہنے کے بارے میں کہہ دیا گیا۔

ایک روز انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے سمندر کے ساحل پر آؤٹنگ کا پروگرام بنایا گیا، جس میں میں نے شامل ہونے سے معذرت چاہی، کیونکہ مجھے ایک کانفرنس کے لئے پیپر لکھنا تھا، جو دوسری مصروفیات کے سبب نامکمل پڑا تھا۔ میں نے پیش کش کی کہ میں چونکہ وہ دن اکیلا انسٹی ٹیوٹ میں گذاروں گا، اس لئے ٹیلی فون اپریٹر بیشک آؤٹنگ پر جانے والی پارٹی میں شامل ہو جائے۔ اس کا کام اس روز میں اپنے ذمہ لینے کے لئے تیار تھا۔ اس وقت تک مجھے پتہ نہ تھا کہ دن بھر میں انسٹی ٹیوٹ میں کتنے فون آتے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کرانے میں کس قدر وقت لگ جاتا ہے کہ اس روز میرے سوا کوئی دوسرا کارکن وہاں پر موجود نہیں ہے۔ ایک فون ایک چھوٹی بچی کا تھا، جو اپنے باپ پاشنسکی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس نام کا کوئی مرد ہماری انسٹی ٹیوٹ میں کام نہیں کرتا۔ البتہ ایک عورت اس نام کی پائی جاتی ہے، جو اس روز آؤٹنگ پر گئی ہوئی تھی۔ مگر وہ مانتی ہی نہ تھی۔ اس نے کہا کہ ٹیلی فون نمبر اس نے اپنی ماں کی ڈائری میں سے لیا تھا، اس لئے غلط نہیں ہو سکتا۔

میں نے اس بات کا ذکر دوسرے روز اندریا سے کیا، تو وہ بہت ہنسی۔ اس نے کہا ہو سکتا ہے کہ

اس کی سات سالہ بیٹی نے اس کی ڈائری میں سے باپ کی بجائے ماں کا نمبر نوٹ کر کے فون کیا ہو۔ وہ بیٹی کی غلط فہمی کو دور کر کے اسے باپ کا نمبر نوٹ کرا دے گی۔ تا کہ اسے پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

دو تین ہفتوں کے بعد اندریا پھر کام پر نہ آئی۔ اس نے فون پر کہہ دیا کہ اب کے بیماری لمبی ہو جائے گی، کیونکہ اس کا اپریشن ہونا تجویز پایا ہے۔ مگر وہ یہ بتانے کے لئے تیار نہ تھی کہ اپریشن کس نوعیت کا تھا۔ اس کو ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھیجنے کے لئے کہا گیا، جو اگلے روز ڈاک سے انسٹی ٹیوٹ میں پہنچ گیا۔ دوپہر کے وقت متعلقہ کارکن نے وہ سرٹیفکیٹ میرے سامنے لا کر رکھا، جس کی عام طور سے ضرورت نہیں ہوتی۔ میں بھانپ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے دیکھا کہ سرٹیفکیٹ خود اندریا کی ہینڈ رائیٹنگ میں لکھا ہوا تھا، جس میں اپنڈکس کے اپریشن کا فوری طور پر کیا جانا تجویز کیا گیا تھا۔ چونکہ وہ ایک ڈاکٹر کے نسخہ لکھنے والے کاغذ پر تھا، اس لئے میں نے کارکن سے کہا کہ وہ متعلقہ ڈاکٹر کی کلینک میں فون کر کے تصدیق کرا لے۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر نے اندریا کے لئے، جس کو وہ بالکل نہیں جانتا تھا، اس روز بیماری کا سرٹیفکیٹ جاری نہیں کیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ اس نام کی کوئی عورت اس کے پاس کبھی علاج معالجے کے لئے نہیں آئی۔ اس کو شبہ تھا کہ کسی نے اس کے مطب سے نسخہ لکھنے والے کاغذات چرا لئے تھے۔ اس نے کہا کہ یہ حرکت عام طور سے نشہ آور دوائیں کھانے والے لوگ کیا کرتے ہیں، تا کہ وہ اپنی مرضی سے نسخے لکھ کر اپنے مطلب کی دوائیں فارمیسی سے حاصل کر سکیں۔

جب اندریا تین ہفتوں کے بعد کام پر حاضر ہوئی، تو اسے بتایا گیا کہ ہمارے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا۔ جعلی ڈاکٹری سرٹیفکیٹ پیش کرنے کی بنا پر ملازمت سے فی الفور برطرفی اور متعلقہ ہیلتھ انشورنس کے پاس رپورٹ، جہاں سے ممکن ہے معاملہ جعل سازی کے سبب آگے عدالت تک پہنچ جائے۔ البتہ اگر اندریا خود استعفیٰ دینے کے لئے تیار ہو، تو ہماری طرف سے اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی۔ وہ اس کے لئے تیار تھی، مگر اس صورت میں اس کو پہلے مہینے میں بیکاری کا الاؤنس نہیں مل سکتا تھا۔

میں نے کہا کہ اس کا آزمائشی وقت ابھی ختم نہیں ہوا، اس لئے ہم از خود اس کی ملازمت وجوہات بتائے بغیر ختم کر سکتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اس کو بیکاری کا الاؤنس پہلے دن سے ملے گا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ نشہ آور دوائیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کچھ کرے۔ کامیابی کی صورت میں اس کو چیف سیکرٹری کی پوسٹ پھر سے مل سکتی ہے، جس کو میں تین چار ماہ تک خالی رکھنے کے لئے تیار

تھا۔اس زمانے میں کئی ایک سرکاری پروگرام نشہ کرنے والوں کو اس لت سے نجات دلانے کے لئے چل رہے تھے۔ مجھے امید تھی کہ اس کو کسی نہ کسی پروگرام میں جگہ مل جائے گی۔اندریا نے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں کوشش کرے گی۔ رخصت کے وقت اس نے یہ سوال کر کے مجھے لاجواب کر دیا کہ میں کیوں اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہوں، جب کہ اور کسی کو اس کی پرواہ نہیں ہے؟

آئندہ دنوں میں یہ سوال بار بار میرے دل میں اٹھتا رہا کہ کیا میں محض اس لئے اس کی مدد کرنی چاہتا ہوں کہ وہ خود اپنی مدد کرنے سے قاصر ہے، یا میں کہیں دل ہی دل میں اس کے ساتھ پیار کرتا ہوں۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ وہ ارادے کی کمزور تھی اور دوسروں کی مدد کے بغیر اس گڑھے سے باہر نہ نکل سکے گی، جس میں وہ گر چکی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ میں اس کو باہر نکلنے کا صرف راستہ دکھا سکتا ہوں، اس کو گڑھے میں سے نکال نہیں سکتا۔ جب تک وہ خود نہ چاہے، کوئی بھی اس کو نہیں نکال سکتا۔

دو تین ماہ کے بعد پتہ چلا کہ اندریا نشہ آور دوائیوں سے نجات دلانے والے ایک پروگرام میں شامل ہوئی تھی، مگر دو چار روز کے بعد بھاگ گئی تھی۔اس پر کمیون نے اس کو کمرہ خالی کرنے کا نوٹس دے دیا تھا، کیونکہ کمیون اندریا کی وجہ سے بدنام ہو رہی تھی۔ان کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ سرکاری محکمے کمیون کو کہیں نشہ آور دوائیں استعمال کرنے والوں کا سنٹر نہ قرار دے دیں۔ میں نے سوچا کہ شاید اب اس کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ اپنے حالات میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے کچھ کرے گی۔

میں نے اندریا کو فون کیا اور کہا کہ سیکرٹری کی اسامی زیادہ عرصے کے لئے خالی نہیں رکھی جا سکتی۔اس لئے اس کو بھرنے کے لئے اشتہار دیا جا رہا ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ اندریا نے نشہ آور دوائیوں سے نجات دلانے والے پروگرام سے کما حقہ فائدہ نہ اٹھایا تھا۔اس نے کہا کہ وہ اس بارے میں مجھ سے بات کرنے کے لئے آنا چاہتی ہے۔ چنانچہ ملاقات کا وقت طے کر لیا گیا۔

اندریا اپنے ایک دوست کی معیت میں آئی، جس کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ وہ بھی اس کی طرح نشہ کرتا ہوگا۔اس دوران میں وہ کمیون کو چھوڑنے کے بعد ایک کمرے کا فلیٹ کرائے پر لے کر رہ رہی تھی۔اس کا سرمایہ تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور سوائے بیکاری کے الاؤنس کے اس کا کوئی دوسرا ذریعہ آمدن نہیں تھا۔ یہ آمدنی شاید ہیروئن خریدنے کے لئے کافی نہ تھی۔اندریا کے دوست نے کہا کہ اگر اور کوئی راستہ سرمایہ پیدا کرنے کا باقی نہ رہا، تو وہ کسی بنک کو لوٹ لے گا۔ پتہ چلا کہ یرگن بنک پر ڈاکہ ڈالنے کے سلسلے میں سزا یافتہ تھا۔اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مطلوبہ رقم کے حصول کی خاطر

سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھا۔شاید میرے چہرے کے تاثر سے اندریا جان گئی تھی کہ میں اس کی طرف سے پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔اس نے کہا کہ مجھے اس کی واپسی کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے اور کسی اچھی سی لڑکی کو سیکرٹری رکھ لینا چاہیئے۔

اس کے بعد عرصہ تک اندریا کے بارے میں کچھ سننے میں نہ آیا۔البتہ اس کی یاد میرے دل میں کانٹے کی طرح اٹکی ہوئی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ میں یا کوئی دوسرا اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔وہ یوں بھی اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی نہیں چاہتی تھی۔جب میں نے ایک بار اس سے پوچھا کہ اس کے ماں باپ کیوں اس کی خبر نہیں رکھتے،تو اس نے جواب دیا تھا کہ وہ اس عمر سے نکل چکی ہے، جب ماں باپ اس کو انگلی سے پکڑ کر چلایا کرتے تھے۔میں نے سوچا کہ جب وہ ماں باپ کی مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتی،تو مجھے کہاں دخل اندازی کی اجازت دے گی۔اس لئے میں نے اس کا پیچھا نہ کیا، وگرنہ اس کو شہر میں تلاش کیا جا سکتا تھا۔آخر مجھے کس نے کہہ رکھا تھا کہ اندریا کو اس کی یقینی تباہی سے بچاؤں۔

میں اس کو اپنی یادداشت سے قریب قریب نکال چکا تھا، جب انسٹی ٹیوٹ میں ایک روز کسی نے اس کا ذکر چھیڑ دیا۔اس نے اندریا کو برلن کے ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔وہ گانے بجانے والے پیوں کے ایک گروپ میں شامل تھی، جو سڑکوں پر مانگ تانگ کر گزارہ کرتا تھا۔اندریا کے دوست کے بارے میں پوچھنے پر بتایا گیا کہ وہ بنک پر ڈاکہ ڈالنے کے سلسلے میں پکڑا گیا تھا اور لمبی قید کاٹ رہا تھا۔ گویا اندریا معاشرے کے اس مقام پر پہنچ چکی تھی، جہاں سے واپس لوٹنے کے راستے مسدود ہیں۔

میرا ماتھا ٹھنکا کہ اندریا کا مدرسی کو خیر باد کہنے کا تعلق نشہ آور دوائیوں کے استعمال سے ہو سکتا ہے۔اس کی پرسنل فائل میں اس کے سابقہ اسکول کا پتہ درج تھا۔میں نے ہیڈ ماسٹر کو فون کیا تو اس نے کہا کہ اگر میں نے اندریا کو ملازمت دینے سے پہلے اس کے ساتھ رابطہ کر لیا ہوتا،تو وہ مجھے اصل صورت حال سے آگاہ کر دیتا۔اس نے کہا کہ اس کو قانونی طور پر ایسی بات لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔البتہ وہ مجھے فون پر بتانے کے لئے تیار تھا کہ اندریا کا کیس نشہ کرنے کا نہیں ہے، بلکہ جنس کی تبدیلی کا ہے۔وہ پہلے مرد تھی اور اس کا نام اندرے تھا۔جب اس کے اندر جنسی تبدیلی آئی،تو اس کے لئے اسکول میں مدرس رہنا ممکن نہ رہا، کیونکہ خطرہ تھا کہ طالب علم اس کا مذاق اڑائیں گے۔اس لئے اس نے خاموشی کے ساتھ مدرسی کو خیر باد کہہ کر میری انسٹی ٹیوٹ میں سیکرٹری شپ کی اسامی کے لئے درخواست دی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اندریا کی سابقہ ملازمت کے کاغذات پر محض سرسری طور پر نظر ڈالی تھی اور غالباً اسی

وجہ سے اس کے نئے نسوانی نام اندریا اور اس کے سابقہ مردانہ نام اندرے میں امتیاز نہ کر پایا تھا۔

(کمرفیلڈ۔۵ مارچ ۲۰۰۳ء)

موروثی مرض

کارین نے فون پر ہمیں اپنی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کرنے کی دعوت دیتے ہوئے بتایا کہ ایوون بھی آ رہی ہے۔ پھر اس نے اضافہ کیا کہ وہ اکیلی نہیں ہوگی، اس کا خاوند گونتھر بھی اس کے ساتھ آئے گا۔ شاید اس نے یہ بات مجھے اطمینان دلانے کے لئے کہی تھی کہ میں وہاں پر اکیلا مرد نہیں ہوں گا، جو ساری شام بیٹھا ہوا بور ہوتا رہے گا۔ اسے پتہ تھا کہ سہیلیوں کی اس محفل میں نسوانی دلچسپی کی باتیں زیر بحث آئیں گی اور چونکہ ان میں سے تین اسکول میں استانیاں تھیں، اس لئے بہت سا وقت پڑھنے اور پڑھانے کے موضوعات پر تبادلہ خیالات میں گذرے گا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ایوون کے خاوند کے آنے سے سیاسیات یا کوئی دوسرا موضوع بھی زیر بحث آئے گا اور مجھے کچھ کہنے سننے کا موقعہ ملے گا۔ وگرنہ عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ میں ان کی محفل میں سارا وقت منہ میں گھنگنیاں ڈالے ہوئے بیٹھا رہتا تھا۔ یوں بھی ہمیں ایوون اور اس کے خاوند سے ملے ایک عمر بیت چکی تھی۔ اس لئے سننے اور سنانے کو بہت کچھ ہوگا۔

کارین دراصل اوتا کی سہیلیوں کی چوکڑی کا حصہ ہے۔ میں چاروں سہیلیوں سے یونیورسٹی کے دنوں سے واقف ہوں۔ یہ سب اس زمانے میں بھی سخت پڑھاکو قسم کی مخلوق تھیں، جن کو جرمن ادبیات کے سوا کسی دوسری چیز میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ اتوار کے اتوار باری باری کبھی ایک کے ہاں اور کبھی دوسری کے ہاں مل بیٹھتی تھیں۔ گاہے بگاہے اوتا مجھے پکڑ دھکڑ کر اپنے ساتھ سہیلیوں کی محفل میں لے جاتی تھی اور میں سارا وقت خاموش بیٹھا ہوا ان کی زبان دانی کے مظاہرات اور جرمن ادبیات پر عبور کے کمالات کو دیکھ دیکھ کر عش عش کیا کرتا تھا۔ ان کی محفلوں میں بیٹھنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے جرمن ادب میں دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے التزام کے ساتھ اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔

ایوون البتہ اس چوکڑی کا حصہ نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہمارا تعارف کارین کی وساطت سے اس

طرح ہوا کہ جب ہم نے شادی کرنے کی ٹھانی اور اسٹوڈنٹ ہوسٹل کو خیر باد کہنے کا ارادہ باندھا اور شہر میں فلیٹ تلاش کرنے لگے، تو ہمیں بے حد مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کی بات ہے، جب ہمبرگ میں فلیٹ اتنی آسانی سے نہ ملتے تھے، جتنے آج کل۔ اس زمانے میں اکثر و بیشتر ایک ایک فلیٹ میں دو اور تین فیملیاں رہائش پذیر تھیں۔ ہمیں اکثر جگہوں پر محض اس وجہ سے جواب دے دیا جاتا تھا کہ ہم یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور لگی بندھی آمدنی نہیں رکھتے تھے۔ مالکان مکان کو شاید یہ خطرہ تھا کہ ہم کرایہ باقاعدگی سے ادا نہ کرسکیں گے۔ ہمیں ملنے والا وظیفہ بس اتنا تھا کہ روکھی سوکھی روٹی چل جاتی تھی۔ باقی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہمیں ٹیوشن پڑھانی پڑتی تھی، جو آئے دن بدلتی رہتی تھی۔ اس لئے بعض مہینوں میں معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور کبھی نہیں ہو پاتی تھی۔

کارین کو پتہ چلا تھا کہ ایوون، جو اسکول کے زمانے میں اس کی ہم جماعت رہ چکی تھی، اپنا پرانا فلیٹ چھوڑ کر ایک نئے فلیٹ میں منتقل ہو رہی تھی۔ اس کی سفارش پر ایوون نے ہمیں اپنا فلیٹ دلوانے کی ہامی بھری اور ہمیں اتوار کے روز فلیٹ دیکھنے کے لئے آنے کو کہا، جب اس کا خاوند گونتھر گھر پر موجود ہوگا۔ وہ میڈیکل ڈاکٹر تھا اور امتحان پاس کرنے کے بعد نیا نیا ایک کلینک میں تعینات ہوا تھا۔ خود ایوون کو بھی ایک اسکول میں ٹیچنگ اپرنٹس شپ مل گئی تھی۔ اس طرح ان کی آمدنی اتنی معقول ہوگئی تھی کہ وہ ایک مہنگے فلیٹ میں منتقل ہو سکتے تھے، جو بلاشرکت غیرے ان کا اپنا ہوگا۔ اور ایوون کے الفاظ میں "جس کا باتھ روم ان کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا پڑے گا"۔ دراصل اس فلیٹ کا، جس کو وہ چھوڑ کر جا رہے تھے، صرف نصف حصہ ان کے پاس تھا۔ اور اگر فلیٹ کے مالک نے ہمیں کرایہ دار بنانا منظور کر لیا، تو یہی نصف حصہ ہمیں مل سکے گا۔

ہمیں سب سے پہلے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ مکان، جس میں فلیٹ پایا جاتا تھا، ایک ایسی جگہ پر واقع تھا، جو شہر کے عین درمیان پائی جانے والی آلسٹر جھیل کے پہلو میں تھی۔ وہاں سے یونیورسٹی آنے جانے میں بہت سہولت تھی۔ کیونکہ وہاں پر جانے والی ٹرام مکان کے سامنے رکتی تھی۔ اس زمانے میں ہمبرگ کے شہر میں ٹرامیں چلتی تھیں، بسوں کا رواج بہت بعد میں جا کر ہوا۔ البتہ فلیٹ ایک پرانی چھ منزلہ بلڈنگ کی سب سے اوپر والی منزل پر چھت کے نیچے تھا، جہاں تک پہنچنے کے لئے نوے سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھی۔ ہم جوان تھے اور یہ چیز ہمارے راستے میں روک نہ تھی۔ ہم نے سوچا کہ فلیٹ مل جائے، تو دن میں ایک یا دو بار اتنی سیڑھیاں چڑھنے میں بھلا کیا حرج ہے۔ ہم اس کو روز کی ورزش سمجھ لیں گے۔ ہمیں

اس وقت ابھی پتہ نہ تھا کہ فلیٹ میں سنٹرل ہیٹنگ نہیں ہے اور ہمیں اوون میں مٹی کا تیل جلانا پڑے گا، جس کے بیس بیس لیٹر کے کنستر مجھے اٹھا کر اوپر لے جانے ہوں گے۔ اس مکان میں لفٹ نہیں تھی۔ ایک فلیٹ ملنے کی خوشی کے موقعہ پر ایسی باتوں کے بارے میں بھلا کون سوچتا ہے؟

ایوون اور اس کے خاوند نے ہمارا استقبال خندہ پیشانی کے ساتھ کیا۔ فلیٹ کو دو حصوں میں اس طرح بانٹا گیا تھا کہ اس کے دو کمرے، جو سڑک کی طرف کھلتے تھے، ایک نوجوان عورت کے پاس تھے، جو سارا ہفتہ اپنی ماں کے پاس رہتی تھی اور صرف ویک اینڈ وہاں گذارنے کے لئے آتی تھی۔ دراصل اسے وہاں اپنے دوست کے ساتھ دو راتیں بسر کرنی ہوتی تھیں، مگر اس بات کا ہمیں اس وقت علم نہ تھا۔ فلیٹ کا دوسرا حصہ، جس میں ایک خاصا بڑا ہال نما کمرہ، باورچی خانہ اور ڈائننگ روم شامل تھے، وہ ایوون اور اس کے خاوند کے پاس تھا۔ یہ حصہ خود کفیل تھا اور فلیٹ کے اندر ایک فلیٹ کی طرح تھا، جس میں داخل ہونے اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرنے کے بعد یہ احساس نہ ہوتا تھا کہ کوئی دوسرا بھی آس پاس فلیٹ میں موجود ہے۔ بس باتھ روم اور ٹائیلٹ دونوں حصوں کے سانجھے تھے۔ ہمیں اسٹوڈنٹ ہوسٹل کی زندگی کا تجربہ تھا، جہاں پر سوائے دو کمروں کے، جو ہوسٹل کے مختلف حصوں میں پائے جاتے تھے، کچھ بھی ہمارا اپنا نہ تھا۔ وہاں پر ہم اس بات کے عادی ہو چکے تھے کہ باورچی خانہ، باتھ روم اور ٹائیلٹ، بلکہ کامن روم، لائبریری، ٹیلی فون، غرض ہر چیز ہمیں دوسروں کے ساتھ بانٹنی پڑتی تھی۔ اس لئے ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا کہ فلیٹ میں ہمیں ایک نوجوان عورت کو برداشت کرنا پڑے گا۔

ایوون اور گونتھر نے کہا کہ انہوں نے اپنے نئے فلیٹ کے لئے فرنیچر خرید لیا ہے۔ اس لئے اگر ہم چاہیئں، تو وہ اپنا پرانا فرنیچر فلیٹ میں ہی چھوڑ جائیں گے۔ ہمیں اس پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا، جب کہ ہمارے پاس پچاس ساٹھ کتابوں، دو سوٹ کیسوں، بوٹوں کے دو دو جوڑوں اور اپنے پہننے والے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے پردے بھی وہیں پر چھوڑ جائیں گے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کے پاس ایک بھاری بھرکم صوفا سیٹ تھا، جو دن کے وقت بیٹھنے کے کام آتا تھا اور رات کو سونے کے لئے ایک پلنگ میں ڈھل جاتا تھا۔ ڈائننگ روم میں میز اور چھ کرسیاں رکھی تھیں، جو البتہ ہماری ضرورت سے بڑھ کر تھیں۔ اس بارے میں انہوں نے کہا کہ کرسیوں سے جان چھڑانی چنداں مشکل نہیں ہے۔ ہم جب چاہیئں ان کو سڑک پر رکھ دیں، ضرورت مند اسی روز اٹھا کر لے جائیں گے۔ وہ صرف رائٹنگ ٹیبل اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، کیونکہ وہ گونتھر کے باپ کی نشانی

تھا، جس کی تھوڑا عرصہ قبل وفات ہوئی تھی۔

فلیٹ کا کرایہ مناسب تھا اور ہمارے لئے اس کی ادائیگی ممکن تھی۔ ہمیں تین ماہ کا پیشگی کرایہ بطور گارنٹی ادا کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا، جس کا ذکر ایوون نے باتوں باتوں میں کیا تھا۔ البتہ اسے خطرہ تھا کہ مالک مکان کرایہ بڑھا سکتا ہے۔ یہ چیز ان کے ساتھ بھی پیش آئی تھی۔ مگر اس وقت تک کسی نے فلیٹ کے مالک سے بات نہ کی تھی اور ہم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ ہمیں بطور کرایہ دار قبول کرنے کے لئے تیار بھی ہوگا یا نہیں۔ ایوون نے تجویز پیش کی کہ ہم چاروں اس سے ملنے کے لئے گارڈن کالونی میں جائیں، جو ہمبرگ کے مضافات میں واقع تھی۔ اس کو امید تھی کہ ان کی موجودگی میں وہ ہمیں کرایہ دار بنانے سے انکار نہیں کر سکے گا۔ ٹیلی فون پر اس کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی گئی۔ مگر گونتھر نے جان بوجھ کر اسے نہ بتایا کہ وہ نقل مکانی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اس بات کا اس کو پتہ چل گیا، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خود ان کے لئے جانشین تلاش کر لے اور ہم خالی ہاتھ رہ جائیں۔

راستے میں گونتھر نے بتایا کہ ہم جس شخص کے پاس جا رہے ہیں، اس کی زندگی کی کہانی بہت الجھی ہوئی اور دکھی ہے۔ وہ یہودی ہے، جس کو نازی جرمنی کے عہد میں قید و بند کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ اس فلیٹ کا مالک نہیں کرایہ دار ہے، البتہ اس کو بہت تھوڑا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس نے اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لئے فلیٹ کو دو حصوں میں بانٹ رکھا ہے اور دونوں ذیلی کرایہ داروں سے اپنے کرائے سے بڑھ چڑھ کر رقم وصول کرتا ہے۔ مالک مکان اس بات کو جانتا ہے، مگر اس بارے میں دخل اندازی سے باز رہتا ہے، کیونکہ اس کو خطرہ ہے کہ یہودی لابی کہیں اس کے پیچھے نہ پڑ جائے، جو جنگ کے بعد پھر ایک بار سر اٹھا رہی تھی۔ یہودیوں کے ہاتھ میں یہ آسان نسخہ آ گیا تھا کہ جو کوئی ان میں سے کسی فرد کے مفاد کے خلاف کچھ کہے یا کرے، اس پر یہودیت دشمنی کا الزام لگا دیا جاتا تھا، جس کو جرمنی کے قانون اساسی میں قابل سزا جرم قرار دیا جا چکا تھا۔ چنانچہ جس کسی پر ایسا الزام عائد کر دیا جاتا تھا، اس کو عدالت کا منہ دیکھنا پڑتا تھا اور اس بات کا اخباروں میں چرچا ہوتا تھا، جس سے سب لوگ ڈرتے تھے۔

ہمیں گارڈن کالونی میں اس کا ٹھکانہ تلاش کرنے میں تھوڑی سی دقت ہوئی۔ جنگ کے خاتمے پر شہر کے مضافات میں ایسی آبادیاں عارضی طور پر قائم کی گئی تھیں، تاکہ لوگ وہاں پر اپنے ذاتی استعمال کے لئے چھوٹی موٹی سبزیاں، ٹماٹر اور آلو وغیرہ اگا سکیں۔ اس غرض سے بلدیہ کی طرف سے ان کو چھوٹے چھوٹے قطعات زمین معمولی سالانہ لگان کے عوض دیئے گئے تھے۔ لوگوں نے وہاں پر پھل دار

پودے لگا لئے تھے اور لکڑی کے چھوٹے موٹے کیبن تعمیر کر لئے تھے، جن میں ہیٹنگ کا انتظام تھا اور مالکان سردیوں کا موسم بھی وہاں پر گذار سکتے تھے۔ اس طریق سے وہ چاہتے تھے کہ ان کو زمین کی ملکیت کے حقوق مل جائیں۔ فلیٹ کا مالک بھی اسی امید پر وہاں دھرنا مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ کام وام تو شاید وہ کچھ نہیں کرتا تھا۔ اس کی آمدنی کا انحصار فلیٹ کے کرائے پر تھا۔ جب ہم آخر کار اس کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور وہ جان گیا کہ ہم اس کے فلیٹ کا نصف حصہ کرائے پر لینے کے لئے آئے ہیں، تو اس نے بیوپاریوں کی طرح نرخ بڑھانے کی کوشش کی۔ گونتھر نے اسے کہا کہ وہ اتنی اونچی پرواز کے لئے پر نہ تولے۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ خود کس قدر کرایہ ادا کرتا ہے۔ اس لئے دس بیس مارک سے زیادہ اس کو کرایہ بڑھانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لمبی چوڑی بحث کے بعد ہم نے اسے پچاس مارک زیادہ دینے کی ہامی بھر لی۔ اور اس سے کرائے نامے پر دستخط کرا لئے، جو ہم تیار کر کے اپنے ساتھ لائے تھے۔

دو ہفتوں میں ایوون اور گونتھر اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہو رہے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے ہمیں فلیٹ کے دوسرے نصف حصے میں رہنے والی نوجوان عورت سے متعارف کرا دیا۔ ایوون نے اس کی الہڑ جوانی اور خوبصورتی کی تعریف کرتے ہوئے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس نے ہمیں خوش آمدید کہا، مگر اس انداز میں، جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے اوپر جبر کر رہی تھی۔ اس بات سے ہم جان گئے کہ اس کے تعلقات ایوون اور گونتھر کے ساتھ کچھ ایسے خوشگوار نہ تھے۔ جرمنی میں عوام الناس تعلیم یافتہ لوگوں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس بات کا احساس انسان کو قدم قدم پر ہوتا ہے۔ شاید اس کے پیچھے احساس کہتری کا ہاتھ ہے، جس کا شکار عام طور سے عامی لوگ ہیں، جو ان کو اکیڈیمک طبقے سے دور رکھتا ہے۔ دونوں طبقوں کی پسند اور ناپسند، زبان اور طور اطوار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، یہاں تک کہ کپڑے پہننا تک جدا جدا ہے۔

فلیٹ کے خالی ہونے تک ہمیں بہت ساری چیزوں کا بندوبست کرنا تھا۔ سب سے اہم ہماری شادی کا مرحلہ تھا، جس کو طے کئے بغیر ہم اپنے اندر فلیٹ میں جا کر اکھٹے رہنے کی جرات نہ پاتے تھے۔ ہمارے بعد آنے والی نسل نے اس سلسلے کے سارے اہتمامات کو یکسر ایک طرف دھکیل کر آزادروی کو اپنا لیا ہے۔ آج کل شاذ و نادر ہی کوئی جوڑا شادی کرتا ہے۔ اور اگر شادی کرتا ہے، تو سالہا سال تک اکٹھے رہنے اور ایک دو بچے پیدا کرنے کے بعد۔ ہم نے رجسٹریشن آفس میں شادی کے لئے درخواست دے رکھی تھی۔ وہاں سے تاریخ ملنے پر ہم دو گواہوں کی معیت میں حاضر ہو گئے اور پندرہ بیس منٹوں کے اندر

سرکاری طور پر ایک جوڑا بن گئے۔ اوتا کو اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ ہمارا نکاح مسجد میں پڑھا جائے، جہاں پر میرے دوستوں کے علاوہ اس کی تینوں سہیلیاں موجود تھیں۔ ہماری شادی خانہ آبادی پر نہ کوئی ڈھول بجا، نہ گیت گائے گئے یا ڈانس ہوا۔ اوتا کے کمرے میں گنتی کے چند مہمانوں کی چائے اور کافی سے ضیافت کی گئی۔ اس سے اگلے روز ہمارا مختصر سا سامان ایک دوست کی کار میں لد کر ہمارے نئے گھر میں پہنچ گیا اور ہماری شادی شدہ زندگی کا نیا باب کھل گیا۔

ایک دو روز کے اندر تمام سامان مہیا کر لیا گیا، جو ایک خود کفایت گھر چلانے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ باورچی خانے میں استعمال ہونے والی کراکری اور دیگچیاں اور دیگر بھانڈے مانڈے تک دوستوں اور واقف کاروں کی عنایت سے ہمیں مل گئے۔ صرف ایک رائٹنگ ٹیبل مجھے خریدنا پڑا، تاکہ میں اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے پر کام کو جاری رکھ سکوں، جو آخری مراحل میں تھا۔ آگے چل کر یہ میز سال ہا سال تک ہمارے پاس رہا اور ہم ایک نقل مکانی سے دوسری تک اسے اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرے۔

ہم چونکہ ایک ہوسٹل سے اٹھ کر آئے تھے، جہاں پر طالب علموں کی سرگرمیوں کے سبب ہمہ وقت اچھی خاصی گہما گہمی رہتی تھی اور انسان کو اطمینان سے راتوں کو سونے تک کی مہلت نہ ملتی تھی، اس لئے ہمیں یہ بات بہت اچھی لگی کہ ہمارے نئے فلیٹ میں باہر کی دنیا سے کسی قسم کا شور شرابا سننے میں نہ آتا تھا۔ مکان کے سامنے سے گذرنے والی سڑک پر چلنے والی ٹرام کی آواز ہمارے کانوں تک نہ پہنچتی تھی۔ ہمیں اس پہلو سے اپنی خوش قسمتی پر اچھا خاصا ناز ہونے لگا تھا اور ہم نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی کہ اس فلیٹ میں پڑھنے لکھنے کے لئے مکمل سکون مل سکے گا، جس کی ہمیں ایک مدت سے تلاش تھی۔

چوتھے یا پانچویں روز ہمیں فلیٹ کے دوسرے حصے سے، جس کا کمرہ ہمارے سونے والے کمرے سے ملحق تھا، بلند ہونے والی چیخ و پکار نے آدھی رات کو اچانک گہری نیند سے بیدار کیا۔ میں نے جانا کہ کوئی شخص ہماری ہمسائی کی جان لے رہا تھا۔ اس لئے میں اسے بچانے کے لئے ادھر جانے کو بستر سے کود کر اٹھا۔ مگر اوتا نے جلدی سے میرے پاجامے کو پیچھے سے پکڑ کر مجھے روک لیا۔ اب جو ہم نے کان لگا کر سنا، تو پتہ چلا کہ عورت عروج شہوت کے مقام پر پہنچی ہوئی تھی اور بے اختیار ہو کر اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ ایسا ناٹک ہم نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھا نہ سنا تھا۔ ہمارا رات کا سکون برباد ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس ڈرامے پر ہنسیں یا روئیں۔ کیا ہمیں ہفتے کے ہفتے ویک اینڈ کی

راتیں اپنی ہمسائی کی شہوت آگیں چیخیں برداشت کرنی اور راتیں آنکھوں میں بتانی ہوں گی؟

دوسرے روز میں نے رات کا ماجرا یونیورسٹی میں دوستوں کے سامنے بیان کیا اور کہا کہ ہم آسمان سے گر کر کھجور میں آن اٹکے ہیں۔ ایک دوست نے کہا اس بات کا بہت آسان حل موجود ہے۔ جب تمہاری ہمسائی اگلی بار شہوت کے عروج پر پہنچی ہوئی ہو، تو دروازے پر زور سے دستک دے کر "خاموشی" پکار دینا۔ پھر دیکھنا کس طرح جھاگ کی طرح اس کی اور اس کے یار کی ساری شہوت جاتی رہے گی۔ کسی اور نے کہا، دیکھنا کہیں حفظ حیوانات والے تم پر مقدمہ نہ دائر کر دیں۔ مقدمہ تو خیر کسی نے دائر نہ کیا۔ مگر ہمسائی ہماری آنکھوں تلے آنے کے قابل نہ رہی۔ ساتھ کے ساتھ اس نے ہمارے خلاف جنگ کا محاذ کھول دیا، جس کا اسے اچھا خاصا تجربہ تھا۔ میں تو خیر اس صورت حال سے نپٹ لینے کے لئے تیار تھا، مگر اوتا کی نازک طبیعت پر یہ چیز بار بن گئی۔ اس کو یہ بھی خیال تھا کہ ہماری ہمسائی خدا جانے کیسے کیسے چور، اچکے اور بھڑوے اپنے ساتھ لاتی ہوگی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم جلد از جلد اپنے لئے دوسرا فلیٹ تلاش کریں۔ یہ سوال اپنی جگہ پر تھا کہ ایک علیحدہ فلیٹ کا کرایہ ادا کرنیکے لئے ہم پیسے کہاں سے لائیں گے؟

مجھے فولکس واگن فاونڈیشن کی طرف سے ڈاکٹریٹ کے لئے ملنے والی گرانٹ ختم ہونے والی تھی۔ یونیورسٹی کی طرف سے امتحان کی تیاری کے لئے وظیفہ ملنے کی امید تھی، مگر اس وقت تک اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے ٹیوشن پڑھانی بند کر رکھی تھی، کیونکہ مجھے اکثر خود طالب علموں کے گھروں پر جانا پڑتا تھا اور جانے آنے پر بہت وقت لگ جاتا تھا، جس کے سبب میں ہفتے میں دو تین روز مقالے پر کام نہ کر سکتا تھا۔ اوتا بھی ایک جگہ پر ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ عین ان دنوں میں اسے وہاں سے اچانک جواب مل گیا۔ وہ شام کو گھر لوٹی، تو میں نے دیکھا کہ وہ سخت پریشان تھی۔ اس نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ ہم اگلے ماہ کا کرایہ ادا نہ کر سکیں گے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں خود کہیں پر کام تلاش کروں، خواہ اس کے نتیجے میں مقالے کی تکمیل میں تاخیر ہی کیوں نہ ہو۔

اگلی صبح میں اس انسٹی ٹیوٹ کے دفتر میں جانے کے لئے گھر سے نکلا، جہاں پر میں کئی برس قبل کچھ عرصہ بطور ریسرچ ایسوسی ایٹ کام کر چکا تھا اور اچھا نام پیدا کیا تھا۔ پھر اپنی تعلیم کی تکمیل کی خاطر اپنی مرضی سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہاں پر کوئی اسامی خالی بھی ہے یا نہیں۔ مگر پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے گھنٹی بجائی اور دروازہ کھلنے پر کوریڈور میں انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کو اپنے سامنے کھڑا

پایا۔اس نے مجھے دیکھتے ہی دونوں بازو ہوا میں لہرا دیئے اور آگے بڑھ کر مجھے کلا بے میں جکڑ لیا۔اس نے کہا کہ وہ مجھے تلاش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کیونکہ انسٹی ٹیوٹ میں چند ماہ قبل کھولے جانے والے ڈاکومنٹیشن سنٹر کے ڈائرکٹر کو یونیورسٹی میں پروفیسر شپ مل گئی تھی اور وہ دو ہفتوں میں انسٹی ٹیوٹ کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔اس نے کہا تم کب تک چارج لے سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ مجھے ابھی ڈاکٹریٹ کرنے میں کم وبیش چھ ماہ لگیں گے۔اس کے بعد میں حاضر ہو جاؤں گا۔اس نے کہا تم یہ چھ ماہ یہاں پر انسٹی ٹیوٹ میں بھی تو گذار سکتے ہو۔تم بیشک اپنا مقالہ یہاں پر آفس میں بیٹھ کر لکھو۔اس طرح مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ تم ہماری ٹیم میں شامل رہو گے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے آفس میں لے گیا۔اس نے اپنی سیکرٹری سے میرے لئے اپوائنٹمنٹ لیٹر تیار کرنے کو کہا۔اس میں میرے لئے مقرر کی جانے والی تنخواہ اتنی زیادہ تھی، جس کا میں نے اس زمانے میں خواب بھی نہ دیکھا تھا۔میرا خیال تھا کہ اس بارے میں سیکرٹری سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ڈائرکٹر نے مجھے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھا، تو شاید اسے خطرہ پیدا ہوا کہ میں کہیں انکار نہ کر دوں۔اس نے کہا ڈاکٹریٹ کر لینے پر اس میں اضافہ کر دیا جائے گا۔

میں گھر پہنچا، تو اس روز کی ڈاک میں ایوون اور گونتھر کی طرف سے ان کے نئے فلیٹ کے لئے دی جانے والی ہاؤس وارمنگ پارٹی میں شمولیت کا دعوت نامہ آیا پڑا تھا۔اوتا نے کہا ہمیں اس میں ضرور شامل ہونا چاہیئے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری نئی ملازمت کے پیش نظر وہ نئے فلیٹ کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ایوون نے اپنے مکان کی تصویر بھیجی تھی۔ بلڈنگ بالکل نئی تھی۔اوتا نے کہا ہو سکتا ہے کہ ابھی سارے فلیٹ کرائے پر نہ چڑھے ہوں۔ کیوں نہ ہم لگے ہاتھوں وہاں پر مالک مکان سے بات کر کے ایک فلیٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔اس زمانے میں کرائے پر چڑھائے جانے والے مکانات تیزی سے بن رہے تھے، مگر فلیٹ حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی اور عام طور سے لوگوں کو نئے فلیٹ کے لئے بہت دوڑ دھوپ کرنی پڑتی تھی۔

پارٹی میں شامل ہونے والوں میں سے اکثر لوگ ہمارے لئے اجنبی تھے۔ وہ یقیناً ایوون اور گونتھر کے کولیگ ہوں گے۔ایوون نے ہمارا تعارف سب لوگوں سے کرایا۔ان میں ایک بے حد خوبصورت لڑکی شیلا بھی شامل تھی، جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ وہ ایوون اور گونتھر کی سب سے زیادہ قریبی دوست ہے۔ پتہ چلا کہ وہ اسی بلڈنگ میں رہتی تھی، بلکہ اسی نے ان کو اس مکان میں فلیٹ دلوایا تھا۔وہ میرے لئے خاص طور پر سیب کے جوس کا گلاس لے کر آئی۔اس نے کہا کہ وہ ہمارے فلیٹ

سے خوب واقف ہے۔ کیونکہ جب وہ اپنے بیٹے فرانک کے حمل سے تھی، تو اسے وہاں پر دو مہینوں تک رہنا پڑا تھا۔ اس سے پہلے وہ اسٹوڈنٹ ہوٹل میں رہتی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ وہاں پر کسی کو پتہ چلے کہ وہ حمل سے ہے۔ اس لئے گونتھر نے اسے کہا کہ وہ ان کے ہاں آ جائے۔ ایوون کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس کے علاوہ اسے پتہ تھا کہ گونتھر طبی طور پر اس کی وہاں پر دیکھ بھال کر سکے گا۔ وہ خود بھی ڈاکٹر تھی اور گونتھر کے ساتھ مل کر اس نے ایک ریسرچ پروجیکٹ پر کام کیا تھا۔ جس کی بنا پر دونوں کو ایک ہی روز ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی تھی۔ اسی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ جرمنی میں طب کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کو کسی ریسرچ پروجیکٹ پر کام کرنا پڑتا ہے، جس میں کامیابی کے بغیر ان کو اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ ہمارے ہاں تو میڈیکل میں بیچلر کی ڈگری پانے والے بھی ڈاکٹر کہلاتے ہیں اور ریسرچ پروجیکٹ پر شاذ و نادر ہی ان میں سے کوئی کام کرتا ہے۔

اوتا کے پوچھنے پر شیلا نے بتایا کہ ان کی بلڈنگ میں سب فلیٹ کرائے پر لگ چکے تھے۔ البتہ اسے امید تھی کہ اگر ہم اس بلڈنگ کی بنانے والی فرم سے رابطہ کریں، جو بہت سی نئی بلڈنگیں تعمیر کر رہی تھی، تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان کی کسی دوسری بلڈنگ میں فلیٹ مل سکے۔ اس فرم کی شہرت اچھی تھی۔

چنانچہ دوسرے روز اوتا نے فرم کے ہیڈ آفس سے بات کی، تو پتہ چلا کہ ان کی ہمبرگ میں آئندہ کئی ماہ تک مکمل ہونے والی بلڈنگوں کے سارے فلیٹ کرائے داروں کے لئے ریزرو ہو چکے تھے اور لوگوں نے چھ چھ ماہ کا کرایہ بطور گارنٹی ادا کر دیا تھا۔ البتہ اگر ہم ہمبرگ کے مضافات میں بنائے جانے والی کسی بلڈنگ میں فلیٹ حاصل کرنا چاہیں، تو امیدواروں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا سکتے ہیں۔ اوتا چاہتی تھی کہ ہم خود بلڈنگ بنائی جانے والی جگہ کو اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھیں۔ اس لئے اس نے فرم سے ہمبرگ سے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع گاؤں تھیس ڈورف میں بنائی جانے والی بلڈنگ کا پتہ چاننا چاہا۔ فرم کے نمائندے نے ہمیں اس نام کے اسٹیشن تک سٹی ٹرین میں سفر کرنے کو کہا، جہاں پر اسکیم کی پہلی بلڈنگ بنائی جا چکی تھی۔ اس نے کہا وہاں سے مشرق کی طرف تین سو گز کے فاصلے پر جہاں مٹی اور پتھروں کا ایک ڈھیر نظر آتا ہے۔ اس جگہ پر ایک آٹھ منزلہ بلڈنگ تعمیر کی جائے گی، جس کی تکمیل ایک سال کے عرصے میں ہو گی۔ اگر ہم پسند کریں، تو وہ ہمارے لئے اس بلڈنگ میں فلیٹ ریزرو کر سکتا ہے۔ اوتا نے مجھے بتائے بغیر فہرست میں نام درج کرا دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں یہ چانس بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

شام کو گھر لوٹنے پر اوتا نے مجھے اس بارے میں بتایا، تو میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسی دور دراز جگہ پر، جہاں ہسپانوی محاورے کے مطابق شیطان نے اپنا پونچھ کھو دیا تھا، جا کر رہنے میں کیا تک ہے؟ مجھے خطرہ تھا کہ ہم ہمبرگ شہر کی گہما گہمی اور وہاں پر آئے دن ہونے والے بے شمار ثقافتی پروگراموں سے کٹ جائیں گے۔ مگر اوتا کی ہٹ دھرمی کے آگے میری ایک نہ چلی۔ ہم نے ویک اینڈ پر وہاں جا کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ اوتا نے کہا کہ اگر وہ جگہ ہمیں پسند نہ آئی، تو ہم اپنا نام کرایہ داروں کی فہرست سے کٹوا سکتے ہیں۔ ایسی فہرستوں میں درج کیا جانا مشکل تھا، نام کٹوانا آسان تھا۔ یوں بھی ہم نے اس وقت تک کوئی پیشگی رقم ادا نہیں کی تھی۔ اس لئے ہمیں کوئی حرجانہ بھی نہیں ادا کرنا تھا۔ اس وقت تک ہم نے بھول کر بھی کبھی تھیس ڈورف کا رخ نہ کیا تھا۔ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ جگہ ہمبرگ سے کتنے فاصلے پر ہے اور جانے آنے پر کتنا وقت لگتا ہے۔

تھیس ڈورف ایک چھوٹا سا خوابیدہ گاؤں تھا، جہاں پر اس زمانے میں انسانوں سے زیادہ ڈھور ڈنگر پائے جاتے تھے۔ البتہ وہاں پر سٹی ٹرین کا اسٹیشن بن چکا تھا، جس کے سبب ہمبرگ کا شہر سرک کر نزدیک آ گیا تھا۔ ریل گاڑی میں شہر کے مرکز تک سفر کرنے پر بیس منٹ لگتے تھے۔ اس سے زیادہ وقت ہمیں اپنے سابقہ اسٹوڈنٹ ہوسٹل سے شہر کے مرکز تک جانے پر لگ جاتا تھا۔ اوتا کو تھیس ڈورف کی کھلی فضا دوسری ساری باتوں سے زیادہ بھاتی تھی۔ اس نے ٹرین سے اترتے ہی، بلکہ اس جگہ پر نظر ڈالنے سے پہلے، جہاں پر وہ بلڈنگ تعمیر کی جانی تھی، جس میں ہمیں ایک سال کے بعد فلیٹ ملنے کی امید دلائی گئی تھی، یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم وہاں پر جا کر بسنا چاہتے ہیں۔

تھیس ڈورف میں ہم چار سال تک مقیم رہے۔ اس دوران اوتا کی چوکڑی کی سہیلیوں کے ساتھ ہمارا رابطہ بدستور قائم تھا۔ مگر اس سارے عرصے میں ایوون اور گونتھر کے بارے میں کچھ سننے میں نہ آیا۔ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ اسی فلیٹ میں رہتے ہیں یا نقل مکانی کر گئے ہیں۔ کارین نے بھی کبھی ان کا ذکر نہ کیا تھا۔ اتنے برسوں کے بعد کارین نے اپنی برتھ ڈے پارٹی میں ان کے آنے کی خبر سنائی، تو میں نے بھی شمولیت کی ہامی بھر لی۔ وگرنہ میں نے بہت دنوں سے ان کی محفلوں میں جانا چھوڑ رکھا تھا۔

ایوون اور گونتھر اس روز ذرا دیر سے آئے اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ گونتھر، جو پہلے مجھ سے کم و بیش ایک سر اونچا ہوا کرتا تھا، اب قد کاٹھ میں میرے برابر تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے ایوون کے کان میں سرگوشی کی کہ کیا گونتھر سکڑ گیا ہے؟ ایوون نے کہا یہ تمہاری یادداشت والا گونتھر نہیں ہے۔ یہ اس کا نعم البدل

ہے۔نام دونوں کا ایک ہی ہے،مگران کی کرتوتوں میں بہت فرق ہے۔

پتہ چلا کہ ایوون نے ہاؤس وارمنگ پارٹی کے چند ماہ بعد اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔شیلا کے بیان کے مطابق گونتھر اس کے بیٹے کا باپ تھا۔پھر جب شیلا کو دوسری بار حمل ٹھہر گیا،تو ایوون نے ان کی گاڑی کا تیسرا پہیہ بننے سے انکار کر دیا اور طلاق لے لی۔نیا گونتھر اس کی طرح ایک اسکول میں پڑھاتا تھا۔ان کی شادی پر دو سال ہو چلے تھے۔گونتھر اور شیلا نے بھی دوسرے بیٹے کی پیدائش پر شادی کر لی تھی۔مگر اس دوران میں وہ علیحدہ ہو چکے تھے۔

دراصل دوسرے بیٹے کی پیدائش پر پتہ چلا کہ اسے ایک موروثی مرض لاحق ہے،جس کے بارے میں گونتھر جانتا تھا کہ وہ اس کے خاندان میں نہیں ہے۔اس نے چاروں کا DNA ٹسٹ کرایا،تو کھلا کہ دونوں بچے گونتھر کے تخم سے نہ تھے۔

(کمرفیلڈ۔۲۶مارچ ۲۰۰۳ء)

سوزانے

نقل مکانی والے روز ہمیں اپنے نئے مکان پر پہنچے بمشکل نصف گھنٹہ ہوا تھا اور ہم ابھی اس چیز کا جائزہ لینے میں مصروف تھے کہ کیا جملہ فرنیچر صحیح وسالم پہنچ گیا تھا اور کیا مزدوروں نے سارے کارٹن، جن میں گھر بار کا سامان بند تھا، ہماری ہدایت کے مطابق درست کمروں میں رکھ دیئے تھے، تا کہ ہمیں بعد میں چیزوں کو ادھر ادھر نہ گھسیٹنا پڑے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ باہر ایک چھوٹی سی پیاری سی سات آٹھ سالہ بچی ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ تھامے ہوئے کھڑی تھی، جو اس کے ماں باپ نے، جو پہلو والے بنگلے میں رہتے تھے، ہمیں خوش آمدید کہنے کے لئے بھیجا تھا۔ پندرہ بیس منٹوں کے بعد سوزانے پھر ایک بار بالمقابل والے ہمسایہ خاندان کی طرف سے پھولوں کا گلدستہ پہنچانے کے لئے آئی۔ ہم اسے مہمان نوازی کے طور پر چاکولیٹ یا کوئی دوسری شیرینی پیش نہ کر سکتے تھے، کیونکہ ہمارا سامان ابھی نہیں کھلا تھا۔ میں نے کہا ہم تھوڑی دیر میں اس کے ماں باپ کا شکریہ ادا کرنے اور ان کے ساتھ تعارف کی خاطر ان کے گھر پر حاضر ہوں گے۔ سوزانے کو یہ جاننے کا شوق تھا کہ کیا ہمارے خاندان میں کوئی اس کا ہم عمر بچہ پایا جاتا ہے۔ وہ پرائمری اسکول کی دوسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ گاؤں میں اس کی بہت سی سہیلیاں موجود تھیں، مگر ان میں سے کوئی ہماری سڑک پر آس پاس نہیں رہتی تھی۔ اس لئے اس کو ان کے ساتھ کھیلنے کے لئے گاؤں کے دوسرے سرے پر جانا پڑتا تھا۔ بعض اوقات لڑکیاں اس کی دعوت پر ان کے باغ میں کھیلنے کے لئے آتی تھیں۔ کبھی کبھی ان کی تعداد بارہ چودہ تک جا پہنچتی تھی۔

اس نے کہا" ہم مل کر اس روز خوب شور مچاتی ہیں"۔ پھر اس نے شاید ہمیں اطمینان دلانے کے لئے اضافہ کیا" مگر اتنا بھی نہیں کہ ہمسائے تنگ پڑ جائیں"۔

اوتا نے کہا" تم بے شک شور مچایا کرنا، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیا تمہارے دوسرے بھائی بہن بھی ہیں یا تم اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہو؟"

"اکلوتی ہوتی، تو خوب تھا۔ میری دو بڑی بہنیں ہیں، جو سخت پڑھاکو ہیں اور اتنے موٹے موٹے شیشوں والی عینکیں لگائے پھرتی ہیں"۔

اس کے ہاتھ کی دو انگلیاں شیشوں کی موٹائی کا اندازہ کرا رہی تھیں۔ کہنے کو تو سوزانے یہ بات کہہ گئی، مگر پھر شاید ہماری ناکوں پر ٹکی ہوئی عینکیں دیکھ کر تھوڑی سی جھینپ گئی۔

اس نے کہا "میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ میری طرح کھیلنے کودنے والی نہیں ہیں"۔

پھر اس کو اچانک جانے کی جلدی پڑ گئی اور وہ خدا حافظ کہہ کر بھاگ نکلی۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہنس پڑے، کیونکہ ہمارے چشموں کے شیشے بھی خاصے موٹے تھے اور ہم کسی سے کم پڑھاکو نہ تھے۔ سوزانے کے چلنے پھرنے کے انداز اور بندروں جیسی پھرتی سے پتا چلتا تھا کہ وہ اتھلیٹ قسم کی لڑکی تھی، جو مضبوط اعضاء کی مالک تھی۔

بے اختیار اوتا کے منہ سے نکلا: "پہلوان دی ماں"۔

یہ پنجابی فقرہ میں نے اوتا کے سامنے ایک آدھ بار ایک دوست کے بارے میں کہا تھا، جو چھوٹے سے قد کاٹھ کا مختصر سا آدمی تھا، مگر بہت بڑ بولا تھا۔ اوتا کے اصرار پر میں نے اسے اس کا مطلب بتایا تھا۔ اب اوتا کے منہ سے اس طنزیے کا اس قدر برمحل استعمال سن کر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے اس بات پر ہمیشہ حیرت ہوا کرتی ہے کہ ایسے بدیسی الفاظ کیونکر اس کے حافظے میں پتھر پر لکیر بن کر محفوظ رہ جاتے ہیں۔

پچھلے پہر ہم سوزانے کے ماں باپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ان کے گھر گئے۔ انہوں نے ہمارا استقبال اپنائیت سے کیا، جیسے وہ ہمیں لمبے عرصے سے جانتے ہوں۔ سوزانے کا باپ میری طرح یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ سوزانے کی ماں نے کہا کہ اس کو ساری عمر تینوں بیٹیوں کے پوتڑے دھونے سے ہی فرصت نہیں ملی، اس لئے اس کا پیشہ خانہ داری ہے۔ اوتا نے کہا کہ وہ کسی بھی دوسرے پیشے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ بچوں کی ماں ہونا بجائے خود ایک کل وقتی ملازمت کے مترادف ہے۔ اسے ذاتی طور پر اس بات کا بہت افسوس تھا کہ وہ ماں نہ بن سکی تھی۔ اس کا بس چلتا، تو وہ لائبریری میں ملازمت کرنے کی بجائے بچوں کے پوتڑے دھوتی، ان کو چلنے پھرنے کا ڈھنگ سکھاتی، ان کی استانی بنتی اور نرس، ان کے ساتھ مل کر ہنستی دوڑتی اور ان کی تربیت کرتی۔

اس دوران میں سوزانے بالمقابل والے ہمسایہ جوڑے کو ہمارے ساتھ ملانے کے لئے بلا لائی

تھی۔ دونوں میاں بیوی ہم سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ ان کی بھی تین بیٹیاں تھیں، جو چند سال ادھر اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئی تھیں۔ جانے سے پہلے وہ ماں کو کتے کا ایک پلا تحفے میں دیتی گئی تھیں، تا کہ وہ اکلاپے کا شکار نہ ہو جائے۔ باپ ایک فرم کا مینجر تھا اور شام تک کاروبار کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا تھا۔ اس کی بیوی بہت خاموش طبع لگتی تھی۔ وہ سب کی باتیں سنتی رہی اور خود اس نے منہ نہ کھولا۔ یوں بھی جرمن پہلی ملاقات میں ایک دوسرے سے نہیں کھلتے اور اپنے ملاقاتیوں سے براہ راست کوئی سوال نہیں پوچھتے۔ اگر کوئی خود کچھ بتانا چاہے، تو اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں، مگر کسی بات کی کرید نہیں کرتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو مزید جاننے کا شوق نہیں ہوتا۔ بس ان کی تربیت اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ملاقاتی کو اپنے سارے رازوں پر سے فی الفور پردہ اٹھانے پر مجبور کریں۔

البتہ ہمیں ان لوگوں کے بارے میں جاننے کا شوق تھا، جو ہم سے پہلے ہمارے مکان میں مقیم رہے تھے۔ ہم ان سے صرف دو بار ملے تھے۔ پہلی بار جب ہم مکان دیکھنے کے لئے آئے تھے اور دوسری بار جب مکان کی رجسٹری کے لئے ہم ان کی ہمراہی میں پبلک نوٹری کے دفتر میں گئے تھے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے ایک یونانی ریستوراں میں جا کر بیٹھے تھے، جہاں پر انہوں نے مکان کی چابیاں ہمارے حوالے کی تھی۔ وہ ایک روز قبل اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ دونوں میاں بیوی ہم سے عمر میں چھوٹے تھے۔ اس لئے ہم ایک دوسرے سے کھل کر بات نہ کر سکے تھے۔ البتہ ان کی زبانی ہمیں اپنے دوسرے ہمسایوں کے بارے میں سرسری سی معلومات مل گئی تھی، جس کے سبب ہم دونوں خاندانوں کے حدود اربعہ سے تھوڑے بہت واقف تھے۔ مگر اپنے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہم بھی ان کے ساتھ لئے دیئے رہے تھے۔ دونوں اطراف نے ایک دوسرے سے کسی قسم کے استفسارات نہیں کئے تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ اس روز کے بعد ہمارا ان کے ساتھ ملنا جلنا نہیں ہوگا۔ انہوں نے ایک دوسرے قصبے میں بنگلہ خرید لیا تھا، جو وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔

تھوڑے دنوں کے بعد ان کا چھوٹا بیٹا اپنا سابقہ مکان دیکھنے کے لئے آیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ہم نے وال ٹو وال کارپٹ نکال دیا تھا اور سارے کمروں میں اورینٹ قالین بچھا دیئے تھے۔ اس کے علاوہ دیواروں پر سے رنگین وال پیپر اتارنے کے بعد سفید وال پیپر لگائے جا چکے تھے۔ اس نے پوچھا کہ کیا ہم ساری عمر سفید دیواروں اور گھر کے سارے کمروں میں بچھائے گئے چھوٹے چھوٹے قالین کے بچونگڑوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اس بات میں اس کا قصور نہیں تھا۔ جب سے

اس نے آنکھ کھولی تھی، ان کے گھر میں رنگین وال پیپر لگے ہوئے تھے اور سارے گھر میں وال ٹو وال کارپٹ کا فرش لگا ہوا تھا۔ اور ینٹ قالین شاید اس نے اس سے قبل نہیں دیکھے تھے۔

ہم نے ہفتہ بھر میں پوری طرح سیٹ ہونے کے بعد ہمسایوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ ہمارا خیال تھا کہ بچیاں بھی ماں باپ کے ساتھ آئیں گی، مگر وہ نہیں آئیں۔ ماں نے کہا اگر آپ کے گھر پر بچے ہوتے، تو وہ ضرور ساتھ آتیں۔ دراصل بچیاں بڑوں کی باتوں میں مخل نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ دونوں بڑی بیٹیاں قریبی قصبے پنے برگ کے جمنازیم میں جاتی تھیں۔ صرف سوزانے ابھی گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔ وہ اپنی بہنوں کے برعکس، جو سخت پڑھاکو تھیں، پڑھنے لکھنے کی بجائے کھیل کود میں لگی رہتی تھی۔ وہ قد کاٹھ میں بھی بڑی بہنوں سے مختلف تھی۔ عمر میں کئی برس چھوٹی ہوتے ہوئے بھی اس کا قد ان سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی ماں نے کہا پتا نہیں یہ چڑیل کیسے ہمارے پلے پڑ گئی ہے۔ اس کو سارا دن نت نئی شرارتیں سوجھتی رہتی ہیں۔ اسکول سے لوٹنے کے بعد وہ کوئی کتاب کھول کر نہیں دیکھتی اور ہوم ورک کو آخری لمحے تک ٹالتی رہتی ہے۔ جب سونے کا وقت آتا ہے اور اس کی بہنیں کمرے کی بجلی بجھانا چاہتی ہیں، تو یہ اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس وجہ سے اس کے لئے کمرہ الگ کرنا پڑا تھا۔

اوتا نے کہا ہمارے ہاں بچہ تو کوئی نہیں، مگر اس سے ملتی جلتی صورت حال کا اسے ہر روز سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ سویرے منہ اندھیرے اٹھنے کی عادی ہے اور شام کو جلد سو جانا چاہتی ہے۔ اس کے برعکس میں آدھی رات سے پہلے سونے کا نام نہیں لیتا اور صبح دم بستر کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ہم آئے دن دیر سے آفس میں پہنچتے ہیں۔ ان دنوں ہمارے پاس ایک ہی کار تھی اور چونکہ ہمارے آفس ہمبرگ میں قریب قریب تھے، اس لئے ہم اکٹھے کام پر جاتے تھے۔ البتہ اوتا مجھے آئے دن دھمکاتی رہتی تھی کہ اگر میں نے اپنی عادت نہ بدلی، تو وہ میرا انتظار کئے بغیر ریل گاڑی سے چلی جایا کرے گی۔ صرف یہی نہیں مجھے صبح کا ناشتہ خود تیار کرنا ہوگا۔ اس کی دھمکی کارگر ثابت ہوتی تھی اور میں وعدہ کرتا تھا کہ اگلے روز سے جلدی اٹھ جایا کروں گا۔ مگر اس پر عمل درآمد کی نوبت کم ہی آتی تھی۔

سوزانے کی ماں نے کہا اس کی بیٹی پر کوئی دھمکی اثر انداز نہیں ہوتی۔ چونکہ اس کا اسکول گاؤں میں ہے اور ان کے مکان سے زیادہ دور نہیں، اس لئے وہ آخری لمحے میں چوکڑیاں بھرتی ہوئی اسکول پہنچ جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی چیز گھر پر بھول جاتی ہے۔ پھر استانی سے اجازت

لے کر دوڑتی ہوئی گھر آتی ہے اور اسی سرعت سے واپس لوٹ جاتی ہے۔ اس کی دونوں بڑی بہنیں اپنی کلاسوں میں ہمیشہ اول آتی ہیں۔ ان کے الٹ سوزانے پڑھنے لکھنے میں اتنی ہوشیار نہیں، البتہ کھیلوں میں وہ سب کو مات کر جاتی ہے۔ ایک دوسرے پہلو سے دیکھا جائے، تو وہ اپنی بڑی بہنوں کے برعکس بہت ملنسار ہے، جس کے سبب وہ گاؤں کے چھوٹے بڑے ہر کسی کو جانتی ہے۔ اس کی زبانی ماں باپ کو سارے گاؤں کی پوری پوری رپورٹ ملتی ہے۔ اسے پتا ہے کہ کون کیا کرتا ہے اور کس کی دوستی کس کے ساتھ ہے اور کس کی کس کے ساتھ نہیں بنتی۔ اس وجہ سے اس کا باپ کہا کرتا ہے کہ ہمارے گاؤں میں سوزانے کے ہوتے ہوئے پولیس چوکی کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے گاؤں میں اس زمانے میں ابھی پولیس چوکی نہیں بنی تھی۔ البتہ ڈاک خانہ کھل چکا تھا۔ اس کے علاوہ کریانے کی ایک دوکان پائی جاتی تھی اور ایک پب، جس میں شام کے وقت گاؤں کے بڑے بوڑھے مل کر بیئر پیتے اور خوش گپیاں کیا کرتے تھے۔ پب کی بلڈنگ ۱۹۱۱ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس زمانے میں وہاں پر گھوڑے گاڑیوں کا اڈا ہوا کرتا تھا، جن کی سروس آگے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر آباد شہر ہمبرگ تک جاتی تھیں۔ عام طور سے لوگ ان گھوڑا گاڑیوں میں سفر کرتے تھے اور ان میں ہی ڈاک بھی آیا کرتی تھی۔ مگر یہ باتیں ہمارے وہاں پر آ کر آباد ہونے سے بہت پہلے کی ہیں۔ تب کمر فیلڈ میں زمینداروں کی آبادی رہی ہوگی، جن میں سے دو چار گھرانے اب بھی پائے جاتے ہیں۔ البتہ اکثر زمیندار اپنے کھیت اور کھلیان بیچ کر گاؤں سے باہر جا چکے ہیں اور انہوں نے زمینوں کی فروخت سے ملنے والی رقم سے گاؤں سے کچھ فاصلے پر نئے فارم بنا لئے ہیں۔ جب ہم نقل مکانی کر کے وہاں پر آئے، تو گاؤں کی آبادی چودہ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ ہمارے وہاں پر قیام کی تین دہائیوں کے دوران بہت سے نئے مکانات بنائے گئے ہیں اور لوگ آس پاس کے شہروں سے اٹھ کر وہاں پر آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ مگر اب بھی گاؤں کی آبادی دو ہزار نفوس سے آگے نہیں بڑھی۔ البتہ دو تین چھوٹے چھوٹے کارخانے لگ چکے ہیں، جہاں پر چند درجن مزدوروں کو ملازمت مل گئی ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ علاقہ گلاب کی نرسریوں کے لئے مشہور ہے، جہاں سے ساری دنیا کو گلاب کے پودے بھیجے جاتے ہیں۔

ہمیں گھر بار کی صفائی ستھرائی کے لئے ایک ملازمہ درکار تھی۔ اس کے علاوہ ہم چاہتے تھے کہ کوئی مالی مل جائے، جو باغ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار ہو۔ دونوں اسامیاں چند روز کے اندر مل گئیں۔ دونوں میاں بیوی تھے اور گاؤں کی قدیم آبادی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بات کا

علم ہمیں بعد میں جا کر ہوا کہ وہ اچھے خاصے متمول لوگ تھے۔ان کے چار مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔دونوں اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر کام کرنے کے لئے آتے تھے، جب کہ ان کی رہائش ہمارے بنگلے سے ایک کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر تھی۔اس زمانے میں ابھی انٹرنیٹ پر اشتہار دینے کا رواج نہیں ہوا تھا، جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آتا ہے، جس کے سبب ملازم تلاش کرنا آسان ہو گیا ہے۔ہمیں ان کے بارے میں سوزانے کی معرفت پتا چلا تھا کہ وہ ایسے چھوٹے موٹے کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس طرح ان کو زائد آمدنی ہو جاتی تھی، جس پر انکم ٹیکس نہیں لگتا تھا۔آگے چل کر حکومت نے ایسے کاموں سے پیدا کی جانے والی آمدنی پر ٹیکس لگا دیا تھا۔ان کی بیٹی سوزانے کی ہم جماعت تھی اور وہ ان کے گھر جایا کرتی تھی۔انہوں نے خرگوش پال رکھے تھے، جن کے ساتھ وہ کھیلنے کے لئے جاتی تھی۔

جرمنی میں ہر سال موسم خزاں میں چرچ کی طرف سے ایک تحریک چلائی جاتی ہے، جس کا مقصد تیسری دنیا کے غریب ملکوں کے لئے چندہ جمع کرنا ہوتا ہے۔یہ رقم ان ملکوں میں رفاہی کاموں پر خرچ ہوتی ہے۔چرچ کے علاوہ ہمارے گاؤں کا اسکول بھی اس سلسلے میں خوب زور شور کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔بچوں کی ٹولیاں گھر گھر جاتی اور چندہ جمع کرتی ہیں۔سوزانے کی ٹولی ہر بار جیت جاتی تھی۔ صرف یہی نہیں وہ دوسرے بہت سے کاموں میں بھی دوسروں سے آگے ہوتی تھی۔مقامی پریس سے پتا چلا تھا کہ ہمارے ہمسایہ گاؤں کی ایک عورت کو خون کا سرطان ہو گیا تھا۔ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ مریضہ کو مرنے سے بچانے کا واحد علاج کسی صحت مند کی ہڈی کے گودے کا ٹرانسپلانٹ کیا جانا ہے۔مگر یہ کام اتنا آسان نہیں ہے، کیونکہ ہر کسی کی ہڈی کا گودا اس کام نہیں آ سکتا۔اور ایسے آدمی کو کیسے تلاش کیا جائے، جس کے خلیوں کی بناوٹ مریض سے ملتی جلتی ہو۔مقامی اخباروں نے اس سلسلے میں باقاعدہ تحریک چلا رکھی تھی، جس کے تحت سب لوگوں کو کہا جا رہا تھا کہ وہ ہسپتال میں جا کر اپنے خون کا ٹسٹ کرائیں۔ چنانچہ سوزانے کے اصرار پر ہمارے گاؤں کے پرائمری اسکول کے بچے بھی اس ٹسٹ میں حصہ لینے کے لئے گئے۔یہ اپریشن قطعاً خطرناک نہیں ہے اور نکالا جانے والا ہڈی کا گودا ہفتوں بلکہ دنوں کے اندر جسم کے قدرتی عمل کے ذریعہ پیدا ہو جاتا ہے۔عام طور سے مریض کو نہیں بتایا جاتا کہ اس کو کس کی ہڈی کا گودا ٹرانسپلانٹ کیا جا رہا ہے اور نہ ہی ہڈی کا گودا دینے والے کو مریض کے بارے میں کسی قسم کی معلومات دی جاتی ہیں۔

سوزانے کے والدین کو ہسپتال کا فون یہ بتانے کے لئے آیا کہ ان کی بیٹی کے خلیوں کی بناوٹ

غیر معمولی طور پر مریضہ سے ملتی جلتی ہے۔ یہ چیز عام طور سے صرف سگے رشتہ داروں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ یہاں پر شاید قدرت نے اس اصول سے استثناء کیا تھا۔ بہرصورت ڈاکٹروں نے سوزانے کو ٹرانسپلانٹ کے لئے ہڈی کا گودا دینے کی خاطر چنا تھا۔ چونکہ سوزانے ابھی بالغ نہیں تھی، اس لئے یہ کام صرف والدین کی اجازت سے سرانجام دیا جا سکتا تھا۔ سوزانے کے ماں باپ اس بات پر بے حد فخر مند تھے کہ ان کی بیٹی اتنی بڑی قربانی دینے کے لئے تیار تھی۔ مگر اجازت دینے سے پہلے وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا گودا نکالے جانے کا سوزانے کی صحت پر کوئی منفی اثر تو نہیں پڑے گا؟۔ ڈاکٹروں نے ان کو یقین دلایا کہ میڈیسن میں ایسے اپریشن اب روزمرہ کی چیز بن چکے ہیں۔ اس لئے انہیں کسی قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیئے۔

چنانچہ سوزانے کی ہڈی کا گودا مریضہ کو ٹرانسپلانٹ کیا گیا، جس کے نتیجے میں مریضہ کی صحت بہت جلد بحال ہوگئی۔ چند ہفتوں کے بعد اس کو گھر واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ مگر وہ ہسپتال کو چھوڑنے سے پہلے اس لڑکی کا نام پتا جاننا چاہتی تھی، جس کی قربانی کے نتیجے میں اس کو نئی زندگی ملی تھی، تاکہ وہ اس کا اور اس کے ماں باپ کا شکریہ ادا کر سکے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ قواعد کی رو سے اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہیئے۔ مگر دوسری طرف وہ مریضہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے صرف اس قدر بتا سکتا ہے کہ وہ لڑکی ۲۱ مئی ۱۹۶۹ء کو پنے برگ کے ہسپتال میں پیدا ہوئی تھی۔ مریضہ نے کہا یہی تاریخ اس کی بیٹی کی پیدائش کی بھی ہے، جس نے اسی ہسپتال میں جنم لیا تھا۔ اب اس کے لئے اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا آسان ہوگیا تھا۔ کیونکہ سرکاری رجسٹر پیدائش واموات سے کسی خاص تاریخ پر پیدا ہونے والے بچوں کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے، بالخصوص اگر ہسپتال کا نام معلوم ہو۔

اس واقع کے چند ماہ بعد سوزانے کے ماں باپ کو فیملی کورٹ کی طرف سے خط ملا، جس میں انہیں سوزانے کو خون ٹسٹ کے لئے مقامی ہسپتال میں ایک مقررہ تاریخ پر پیش کرنے کے لئے کہا گیا تھا اور تاکید کی گئی تھی کہ وہ خود بھی اس روز وہاں پر حاضر ہوں۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید اس چیز کا تعلق کسی متعدی مرض کی تفتیش سے تھا، جو شاید اسکول کے بچوں میں پھیل نکلی تھی۔ مگر اس صورت میں سوزانے کے اسکول کے دوسرے بچوں کو بھی بلایا جانا چاہیئے تھا۔ پھر اس کی دونوں بڑی بہنوں کو ساتھ لانے کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور تھی کہ خط فیملی کورٹ کی طرف سے آیا تھا، جس کا حفظان صحت عامہ کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انہوں نے اس بارے میں ہم سے مشورہ کیا،

مگر ہم بھی کوئی حتمی رائے نہ دے سکتے تھے۔ فیملی کورٹ نے ٹیلی فون پر خون کی تفتیش سے قبل اس بارے میں کچھ بتانے سے انکار کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ معاملہ کورٹ میں داخل شدہ کسی مقدمے سے تعلق رکھتا تھا۔ البتہ یہ امر واضح تھا کہ معاملہ فوجداری نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ سوزانے کو کسی غلط فہمی کی بنا پر بلایا جا رہا ہو۔ مگر یہ معما ہم بھی نہ حل کر پائے کہ سوزانے کے ماں باپ کو کیوں اس کے ساتھ حاضر ہونے کی تاکید کی گئی تھی۔ کیا ان کے خون کی بھی تفتیش کی جائے گی؟

خون کی تفتیش کے بعد عدالت کی طرف سے ایک تاریخ مقرر کی گئی، جس پر سوزانے کے ماں باپ کو حاضر ہونے کے لئے سمن بھیجا گیا۔ وہاں پر ان کی ملاقات اس عورت کے ساتھ ہوئی، جس کو سوزانے کی ہڈی کا گودا ٹرانسپلانٹ کیا گیا تھا۔ اسی کی درخواست پر سارا معاملہ حرکت میں آیا تھا۔ پتا چلا کہ اس کی بیٹی عین اسی روز اسی ہسپتال میں پیدا ہوئی تھی، جہاں پر سوزانے نے جنم لیا تھا۔ وہاں پر کسی غلط فہمی کی بنا پر دونوں بچیوں کا آپس میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ ان کو ہمارے ہمسایہ فیملی کی بیٹی دے دی گئی تھی، جس کو انہوں نے اپنی بیٹی سمجھتے ہوئے پیار و محبت کے ساتھ پالا پوسا تھا۔ دوسری طرف سوزانے کے اصل ماں باپ کے درمیان اس دوران میں ناچاقی پیدا ہو گئی تھی اور نوبت طلاق تک پہنچی تھی۔ جب بچی کے لئے نفقہ ادا کرنے کی خاطر مقدمہ عدالت میں گیا، تو باپ نے اس شبہے کا اظہار کیا کہ وہ بچی اس کے نطفے سے نہیں ہوسکتی۔ اس کو شروع سے اس بارے میں شک تھا، جس کا اظہار وہ اپنی بیوی کے سامنے متعدد بار کر چکا تھا۔

چنانچہ عدالت نے اس بارے میں طبی تفتیش کرائی اور بلڈ ٹسٹ ہوئے، تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ مرد کا شبہ درست تھا۔ عورت نے عدالت کو یقین دلایا کہ اس کے جنسی تعلقات اپنے مرد کے سوا کبھی کسی دوسرے مرد کے ساتھ نہیں رہے، اس لئے ہوسکتا ہے کہ ہسپتال میں اس کی بچی کا کسی دوسری وہاں پر پیدا ہونے والی بچی سے تبادلہ ہو گیا ہو۔ اسے پتا تھا کہ اس مفروضے کا ثبوت ملنا بہت مشکل تھا۔

پھر جب سرطان کے مرض کے سلسلے میں اس کو ہڈی کے گودے کی ٹرانسپلانٹ کے مرحلے سے گزرنا پڑا اور ڈاکٹر نے بتایا کہ جس لڑکی کی ہڈی کا گودا اس کو ٹرانسپلانٹ کیا تھا، وہ عین اسی روز پنے برگ کے ہسپتال میں پیدا ہوئی تھی۔ جہاں پر اس نے اپنی بیٹی کو جنم دیا تھا، تو اسے یقین آ گیا کہ وہی لڑکی دراصل اس کی بیٹی ہے، جو کسی غلط فہمی کے سبب دوسرے خاندان کے حوالے کر دی گئی تھی۔

فیملی کورٹ نے دونوں بچیوں کے تبادلے کی تاریخ مقرر کی، جس پر سوزانے اپنی اصلی ماں کے

سپرد کر دی گئی اور ہمارے ہمسائے اپنی بیٹی ایلفر یدے کو گھر لے آئے۔ مگر ان کو یہ نام بالکل پسند نہ آیا، جو دوسری فیملی کا دیا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا ایلفر یدے بہت دقیانوسی نام ہے۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ ان کی بیٹی گیارہ برسوں تک اس نام سے پکاری جاتی رہی تھی۔ ان کا پسندیدہ نام سوزانے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس کے کپڑے لتے، کھلونے اور دوسری ساری چیزیں، جو اس کی ملکیت تھیں، وہ بھی اس کے ساتھ گئی تھیں۔ مگر ایک چیز کو ہم نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ہمیں اپنے ہمسایوں سے بڑھ کر سوزانے کے چلے جانے کا افسوس تھا۔ وہ تو شاید اپنی اصلی بیٹی کے مل جانے پر خوش تھے، جس کا ناک نقشہ ہو بہو ان کی دونوں بڑی بیٹیوں سے ملتا جلتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی طرح اس نے بھی موٹے شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ سوزانے کے برعکس وہ کھلاڑی ہونے سے زیادہ پڑھاکو ٹائپ تھی اور اپنی کلاس میں ہمیشہ اول آتی تھی۔

ہمیں یا ہمارے ہمسایوں کو علم نہیں ہے کہ سوزانے کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ کیا وہ اپنی اصلی ماں کے مل جانے پر خوش تھی یا نہیں۔ اس کی زندگی ہمارے ہمسایوں کے گھرانے میں بہت آسائش و آرام سے گزری تھی۔ اس کی ماں اسے یہ کچھ مہیا نہ کر سکے گی، کیونکہ اس کی شادی ٹوٹ چکی تھی۔ سوزانے کے باپ نے اسے طلاق دے دی تھی۔ وہ اس دوران میں کسی دوسری عورت کے ساتھ رہ رہا تھا۔ چونکہ وہ بچی کے لئے نفقہ نہیں دینا چاہتا تھا، اس لئے وہ چاہتا تھا کہ یہ ثابت ہو جائے کہ ایلفر یدے اس کے نطفے سے نہیں ہے۔ پھر جب تفتیش سے پتا چلا کہ دراصل سوزانے اس کی بیٹی ہے، تب بھی وہ نفقہ دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ اور ہم جانتے ہیں کہ حق پر ہونا اور عدالت کے ذریعہ حق حاصل کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس لئے ہمیں بہت تشویش تھی۔ مگر ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ہم نے سوزانے کو جانے سے پہلے کہا تو تھا کہ وہ جب چاہے ہم سے رابطہ کر سکتی ہے اور یہ کہ ہم ہر وقت اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ مگر ہم اپنے طور پر اس سے رابطہ کرنے سے گھبراتے تھے کہ خدا جانے ہمارے ہمسائے اس چیز کو کیا نام دیں گے۔ لگتا تھا کہ وہ خود سوزانے کو بھلا بیٹھے تھے۔ انہوں نے کبھی بھول کر بھی اس کا ذکر نہ کیا تھا۔ ان کا سارا وقت ایلفر یدے کے لئے وقف تھا، جو گیارہ برسوں تک دوسری فیملی کے پاس رہی تھی اور جس نے اس دوران میں وہاں پر میاں بیوی کے درمیان لڑی جانے والی جنگ کو قریب سے دیکھا تھا۔ چنانچہ جب وہ ہمارے ہمسایوں کے گھر آئی، تو بے حد ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔ اس کے بالمقابل سوزانے کو یہ کچھ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔ اس

نے ایک آزادانہ ماحول میں پرورش پائی تھی، جہاں پر کسی قسم کی بندش نہ تھی اور جہاں پر اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ اس کا واسطہ کبھی اقتصادی بدحالی سے نہیں پڑا تھا۔ اس کے مقابلے میں ایلفریدے نے آسائش کے دن نہیں دیکھے تھے۔ کیونکہ ان کے گھر میں ماں باپ کے درمیان جنگ جاری تھی، جس کے چھینٹے اس پر بھی پڑتے تھے۔ یہاں تک کہ باپ نے کھلم کھلا اس کی موجودگی میں کہہ دیا تھا کہ ایلفریدے اس کے تخم سے نہیں ہے۔

ہمیں امید تھی کہ کسی روز سوزانے خود ہم سے رابطہ کرے گی یا کم سے کم اپنی سابقہ فیملی کو ملنے کے لئے آئے گی، تو ہمارے ہاں بھی چکر لگائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس نے پورا سال بھول کر بھی ادھر کا چکر نہ لگایا۔ یہاں تک کہ کبھی اس کا فون بھی نہ آیا۔ اس کی ماں ایک ہمسایہ گاؤں میں رہتی تھی اور ان کو اشیاء کی خریداری کے لئے قریبی شہر پنے برگ جاتے ہوئے ہمارے گاؤں کی سڑک پر سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ مگر وہ ہمیں کبھی راستے میں دکھائی نہیں دی، نہ ہی پنے برگ کے بازار میں کبھی نظر آئی، جب کہ ہمیں وہاں پر آئے دن بھولے بسرے دوستوں یاروں سے ملنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔

آخر ایک روز ہم نے خود ان کے گھر پر فون کیا اور یہ جان کر بے حد حیران ہوئے کہ ان کا فون کٹ چکا تھا۔ ہم نے اس بات کا ذکر اپنے ہمسایوں سے کیا، تو پتا چلا کہ سوزانے اور اس کی ماں کسی نامعلوم جگہ پر نقل مکانی کر گئے تھے۔ انہوں نے نیا ایڈریس کسی کو نہیں دیا تھا۔ سوزانے کی سالگرہ پر اس کے نام بھیجا جانے والا کارڈ واپس آ گیا تھا۔ جرمنی میں ڈاک صرف نصف سال تک نئے پتے پر ری ڈائرکٹ کی جاتی ہے۔ اس کے بعد خط واپس کر دیئے جاتے ہیں۔

اب صرف یہ ہو سکتا تھا کہ مقامی انتظامیہ سے رابطہ کیا جائے، جس کے پاس تمام شہریوں کی رجسٹریشن ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص کسی نئی جگہ پر منتقل ہوتا ہے اور اپنے نئے ٹھکانے کی رجسٹریشن کراتا ہے، تو اس پتے کی اطلاع سابقہ رجسٹریشن آفس کو بھیج دی جاتی ہے۔ اس طرح ہر شخص کے حالیہ ٹھکانے کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دی جانے والی درخواست کے لئے کوئی جواز بھی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ ہم اس بارے میں پوچھنے والے کون ہوتے ہیں؟ ہمارے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں اور نہ ہی ہم اپنے ہمسایوں کو باور کرا سکتے ہیں کہ ہمیں ان سے بڑھ کر سوزانے کے بارے میں جاننے کا شوق ہے۔ اس طرح یہ معاملہ تعویق میں پڑتا چلا گیا اور اس بات پر کئی سال گزر گئے۔

ہمارے ہمسایوں کی بچیاں جوان ہو گئی ہیں۔ بڑی امریکہ میں شادی شدہ ہے اور دو بیٹیوں کی

ماں ہے ۔منجھلی میڈیکل ڈاکٹر ہے ۔اس کی بھی ایک بیٹی ہے ۔سب سے چھوٹی نے کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کی ہےاور ایک امریکن فرم میں ملازمت کررہی ہے ۔مگر کسی کو علم نہیں ہے کہ سوزانے کہاں پر ہوتی ہےاور کیا کرتی ہے۔

(کمرفیلڈ۔۲۲اپریل۲۰۰۶ء)

ضمیر کی ملامت

یہ مئی ۱۹۷۶ء کی بات ہے۔ ہمبرگ کی بندرگاہ کی سالگرہ کے سلسلے میں منعقد کئے جانے والے پروگراموں کو دیکھنے کے لئے، جو پورے دن پر پھیلے ہوئے تھے، میں خاص طور پر شہر گیا۔ سب سے پہلے مجھے دوپہر کے کھانے کے لئے مچھلی کے ریستواں میں جانا تھا، جہاں پر اس روز کوئی خالی کرسی دکھائی نہ دیتی تھی۔ میری طرح کئی ایک دوسرے آدمی بھی کرسیوں کے خالی ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ سب کی نظریں ایسی میزوں کے گرد گھوم رہی تھیں، جہاں پر بل پیش کیا جا رہا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ دو چار منٹوں میں وہ لوگ اٹھ جائیں گے اور ان کی جگہ لینے کے لئے دوسرے لوگ ہر طرف سے ہجوم کر کے آگے بڑھیں گے۔ جو کوئی قریب تر ہوگا وہ خالی ہونے والی کرسی پر قبضہ جما لے گا اور دوسرے منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ میں اس کھیل سے خوب واقف تھا اور اکیلا ہونے کی وجہ سے خطرہ تھا کہ مجھے دیر تک انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر کوئی جوڑی دو کرسیاں خالی کرتی ہے اور میں ان میں سے ایک پر بیٹھ جاتا ہوں اور دوسری کرسی خالی رہ جاتی ہے، تو یہ چیز بداخلاقی سمجھی جائے گی، بالخصوص اگر انتظار کرنے والوں میں جوڑے موجود ہوں۔ اس لئے میری نظریں نہ صرف خالی کرسی کی متلاشی تھیں، بلکہ اپنے لئے کوئی جوڑی بھی ڈھونڈ رہی تھیں۔ حسن اتفاق سے مجھے انتظار کرنے والوں میں ایک پیاری سی لڑکی نظر آ گئی، جو میری طرح اکیلی تھی۔

چنانچہ پہلی خالی ہونے والی میز کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اسے آنکھوں سے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی شاید کسی ایسی پیش کش کے انتظار میں تھی۔ وہ لوگوں کو دائیں بائیں دھکیلتے ہوئے مجھ سے آ ملی۔ دوسروں نے گمان کیا ہوگا کہ ہم اکٹھے آئے تھے۔

میں نے اپنے آپ کو خوش قسمت گردانا، کیونکہ اس طرح یکمشت دو مقصد پورے ہو گئے تھے۔ ریستوران میں خالی کرسی کا ملنا عام طور سے اتنا بڑا مرحلہ نہیں ہوا کرتا، جتنا کسی اکیلی دکیلی لڑکی سے

تعارف ہونا۔ ہوسکتا ہے کہ اسے بھی یہی بات سوجھی ہو، کیونکہ جب ہم اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور آرڈر دینے کی خاطر مینیو کا مطالعہ کرنے لگے، تو اس نے میری طرف جھک کر کہا۔

"تو گویا آج کے دن ہمارا ملنا ستاروں میں لکھا تھا"۔

"جب میں گھر سے چلا تھا، تو مجھے صرف یہ پتہ تھا کہ میں ہمبرگ کی بندرگاہ کی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے جارہا ہوں۔ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ وہاں پر ایک پری میرا راستہ کاٹے گی"۔

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا" مجھے پری نہ جانو، میں پوری پوری چڑیل ہوں اور چھوٹے موٹے بچوں کو زندہ کھا جاتی ہوں"۔

"چلو ہم تمہیں چڑیل مان لیتے ہیں، مگر یہ آدم خوری کا مشغلہ چہ معنی دارد؟ اب تک کتنوں کو ہضم کر چکی ہو؟"

"ابھی گنتی نہیں کی۔ بس یہ جان لو کہ کشتوں کے پشتے لگاتی جارہی ہوں"۔

"اب تک میرا واسطہ تم جیسی خوفناک مخلوق سے نہیں پڑا تھا۔ چلو یہ تجربہ بھی سہی۔ میں کونسا تم سے شادی کرنے کی ٹھانے بیٹھا ہوں"۔

"بس تم کو خبردار کرنا مقصود تھا، تاکہ تم کسی خوش فہمی کا شکار نہ بن جاؤ"۔

"ہمیں ایک دوسرے سے کیا لینا دینا ہے۔ تم چاہو تو میں آج شام تک تمہارا ساتھ دوں گا۔ پھر ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔ اتنے بڑے شہر میں ہمارا دوسری بار ملنے کا چانس یوں بھی کچھ ایسا زیادہ نہیں ہے۔ اگر اس کے باوجود قسمت کبھی ہمیں ایک دوسرے کے روبرو لے آئی، تو ہم ایک دوسرے کو جاننے سے انکاری ہو جائیں گے"۔

"دوسری بار ملنے میں رکھا بھی کیا ہے۔ جو کچھ کہنا سننا اور کرنا کرانا ہے، وہ آج ہی ہو جائے، تو اچھا ہے"۔

اتنے میں ویٹریس آرڈر لینے کے لئے پہنچ گئی۔ اس کے جانے کے بعد لڑکی نے کہا۔

"ہمیں ایک دوسرے کا نام جاننے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں "موبی" کا نام دے رہی ہوں۔ تم بھی میرے لئے کوئی بھلا سا نام تجویز کر سکتے ہو"۔

"میشی" کا نام کیسا رہے گا؟"

"بہت خوب۔ اب تک کسی نے مجھے یہ نام نہیں دیا تھا"۔

"کیا یہ سوسائٹی کا کوئی نیا کھیل ہے؟"

"یہ کھیل میری اپنی ایجاد ہے اور میں بھی اسے پہلی بار کھیل رہی ہوں۔ ابھی اس کے قواعد و ضوابط طے نہیں ہوئے۔ ہم ایک دوسرے کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ اور اگر کچھ بتائیں گے، تو ضروری نہیں ہے کہ وہ حقیقت کی غمازی کرتا ہو"۔

"پھر تو رج کے جھوٹ بولا جا سکتا ہے"۔

"اب یہ بھی نہیں ہے کہ ہمیں سارا دن جھوٹ بولنا ہوگا۔ تمہارا دل چاہے تو بیشک اس میں سچ کا تڑکا لگاتے چلے جانا۔ میں بھی اسی قسم کی کھچڑی بناؤں گی۔ پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ تصور کریں"۔

"تمہارے ہاتھ شادی یا منگنی کی انگوٹھی سے عاری ہیں۔ اس کے باوجود قرین قیاس ہے کہ تم شادی شدہ ہو۔ تم جیسی لڑکی کے ساتھ ہر کوئی شادی کرنے کو پھرتا ہے"۔

"تم بیشک مجھے شادی شدہ تصور کر لو۔ مگر تمہارا گمان اس بات کی طرف کیوں نہیں گیا کہ میں طلاق شدہ بھی تو ہو سکتی ہوں؟"

"چلو ہم تمہیں طلاق شدہ تصور کر لیتے ہیں۔ تمہاری شادی کتنے دنوں تک چلی تھی؟"

"بہت دنوں تک نہیں، مگر تم یہ جان کے کیا کرو گے۔ دوسری طرف مجھے یقین ہے کہ تم اب بھی شادی شدہ ہو"۔

"تم مجھے بیشک شادی شدہ تصور کر لو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ ہمارا ساتھ آج شام تک رہے گا۔ اس کے بعد تم اپنے گھر چلی جاؤ گی اور میں اپنے گھر"۔

"تم ابھی سے جدا ہونے کی باتیں کرنے لگے ہو۔ ہمیں پورا دن اکٹھے گزارنا ہے، جس کے دوران بہت کچھ وقوع میں آ سکتا ہے"۔

"ہم یہ بات تو پہلے سے طے کر چکے ہیں کہ ہمارا ساتھ بس آج شام تک کے لئے ہے۔ اس کے بعد میں تمہارا پیچھا نہیں کروں گا اور تم بھی مجھے بھول جاؤ گی"۔

"کسی کا پیچھا نہ کرنا اور اس کو بھول جانا دو مختلف چیزیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تم میرا پیچھا نہیں کرو گے، مگر کیا تم مجھے بھول سکو گے۔ اس بات کی ضمانت کون دے سکتا ہے؟"

"ضمانت تو خیر میں کسی بات کی نہیں دے سکتا۔ البتہ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ آج کا

دن تمہاری معیت میں خوب گزرے گا"۔

"سورج کے غروب ہونے سے پہلے دن کو نہیں سراہنا چاہیئے ۔کون جانتا ہے کہ شام تک ہمارے درمیان کیا کچھ بیتے گا"۔

جب کھانے کے بعد کافی کا آرڈر دیا گیا اور ویٹر لیس عام رواج کے مطابق اس کے ساتھ چینی کے دو ننھی منی تھیلیاں بھی لائی اور میں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے حصے کی چینی کو واپس کرنا چاہا، تو میشی نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔اس نے کہا کہ اسے چینی کی تھیلیاں جمع کرنے کا شوق ہے، جن کو وہ اپنے کچن میں سجا کر رکھتی ہے۔ان تھیلیوں پر عام طور سے ریستورانوں کا اشتہار ہوتا ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں تھی، میشی نے ریستوراں کا بل، جو دونوں کے لئے اکٹھا بنایا گیا تھا، ادا کئے جانے کے بعد اپنے قبضے میں کرلیا۔اس نے کہا کہ وہ ریستوانوں کے بل بھی جمع کرتی ہے۔

ہم جس ریستوراں میں بیٹھے تھے، وہ شہر کے عین مرکز میں واقع تھا۔عام طور سے اتوار کے روز اندرون شہر کی سڑکیں خاصی اجاڑ ہوتی ہیں۔مگر بندرگاہ کی سالگرہ کے سبب ہر طرف خوب گہما گہمی تھی۔ اتنے لوگ عام طور سے صرف سالانہ سیل لگنے پر آتے ہیں، جب سیزن کے کپڑے سستے داموں بکتے ہیں۔اس روز کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والوں نے ہر طرف اسٹال لگا رکھے تھے۔جس کے سبب میلے کا سا سماں بندھا ہوا تھا۔خاص طور پر بلدیہ کی عمارت کے سامنے کھلے میدان میں لوگوں کا ہجوم تھا۔موسیقی کے گروپوں نے اپنے اپنے پنڈال لگا رکھے تھے۔اس زمانے میں ٹوسٹ ڈانس بہت مقبول تھا اور نوجوان لڑکے لڑکیاں کولہوں کو گھما گھما کر ناچ رہے تھے۔

میشی نے کہا" اب اس پاگل پن کو دیکھو۔ یہ ڈانس نہیں سراسر خودکشی ہے، جس کے سبب نوجوانوں میں کمر درد کی شکایت متعدی مرض کی طرح پھیلتی جارہی ہے"۔

"یہ سب فیشن کے مارے ہوئے ہیں۔اگر کل کلاں کو سر کے بل چلنے کا فیشن نکل آیا، تو یقین جانو کہ سب کی ٹانگیں اوپر ہوا میں لہرا رہی ہوں گی"۔

"پھر تو ہم جیسے لوگوں کو چاند پر پناہ لینی پڑے گی"۔

"وہاں پر کشش ثقل کی کمی کے سبب امریکی اسٹرو ناوٹ آرمسٹرانگ چلتا نہیں پھلانگتا پھرتا تھا۔ اگر وہ سر کے بل گر جاتا، تو پھر اسے شاید اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا"۔

"پھر تو یہ بہتر ہے کہ ہم یہاں دھرتی پر ہی رہیں، جہاں پر سانس لینے کے لئے آکسیجن مفت میں

مل جاتی ہے اور انسان کو اسٹرو ناوٹوں والا اوور آل نہیں پہننا پڑتا"۔

"یہاں پر بھی تو لوگ میک اپ کئے، نئے فیشن کے کپڑے پہنے یوں پھرتے ہیں، جیسے تھیٹر کے فنکار ہوں اور کسی نامعلوم مصنف کی تخلیق کردہ کہانی میں کوئی رول ادا کر رہے ہوں"۔

"میرا رول ایکسٹرا کا ہے۔ پتا نہیں تم کونسا پارٹ ادا کر رہے ہو؟"

"میں محض تماشائی ہوں، جو سب کچھ دیکھتا ہے اور کچھ نہیں سمجھ پاتا"۔

"آج کے لئے تمہارا رول طے شدہ ہے۔ میں تمہاری امان میں ہوں۔ آج شام تک تم میرے محافظ ہو۔ میں تمہارا بازو تھام کر چلتی ہوں اور تم اس بات کو نظر میں رکھتے ہو کہ مجھے کوئی گزند نہ پہنچے"۔

"یہ بھی خوب رہی۔ بیٹھے بٹھائے تم نے مجھے اس قدر اہم کردار بنا دیا ہے۔ مجھے خبر ہوتی کہ مجھے محافظ کا رول ادا کرنا ہے، تو میں چھوٹی موٹی تلوار یا ایک بھلی سی سوٹی ساتھ لاتا۔ کون جانتا ہے کہ ہمیں شہر کی سڑکوں پر کیسے کیسے درندوں سے واسطہ پڑے گا"۔

"میرا سابقہ شوہر اس شہر میں نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یوں بھی میں یہاں پر نو وارد ہوں اور تمہارے سوا کسی کو نہیں جانتی"۔

"تم مجھے کیسے جان سکتی ہو۔ ہمیں ایک دوسرے سے ملے ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا؟"

"تو پھر تمہیں اپنے بارے میں خود بتانا ہوگا"۔

"تم کیا جاننا چاہتی ہو؟"

"تم کہاں سے ہو اور زندگی نے اب تک تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے؟"

"مجھے اپنی زندگی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ کیا تم پہلے بھی کسی غیر ملکی سے ملی ہو؟"

"میرا سب سے پہلا غیر ملکی دوست افریقہ کے ملک گنی کا رہنے والا تھا۔ مجھے جو چیز اس میں بہت بھاتی تھی، وہ یہ تھی کہ موسیقی اس کے انگ انگ میں بھری ہوئی تھی اور وہ کسی دیومالائی غیر ارضی دیوتا کی طرح ناچتا تھا۔ میں اس زمانے میں بیلے ڈانس کی کلاسیں لے رہی تھی۔ بدقسمتی سے میرے باپ کو ہماری دوستی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ شاید وہ ممدو کی کالی چمڑی سے ڈرتا تھا اور اس کو اپنی سفید فام بیٹی کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ جب مجھے اس سے ملنے سے روک دیا گیا، تو میں چھپ چھپ کر اسے ملنے جاتی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کرنی چاہتا تھا، مگر میرے باپ نے اس کی اجازت نہ دی"۔

"مجھے یقین ہے کہ تم دوستوں کے سلسلے میں قحط کا شکار نہیں رہی ہو"۔

"دوستوں کی کمی کی شکایت مجھے کبھی نہیں رہی۔ البتہ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کس پر اعتبار کیا جائے۔ یہ چیز میں نے اپنی ماں سے وراثت میں پائی تھی، جو ہر مرد کو شک کی نظر سے تکتی تھی۔ وہ مجھے کہا کرتی تھی کہ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، جو عورتوں کو بس ایک ہی مقصد کے لئے اپنے قابو میں لانا چاہتے ہیں۔ پھر جب اس میں کامیابی ہو جاتی ہے، تو وہ عورت کو جوٹھے بھانڈے کی طرح اٹھا کر ایک کونے میں پھینک دیتے ہیں"۔

" کیا دنیا تمہارے تجربے کے مطابق تمہاری ماں کی خیالی دنیا جیسی ہے یا اس سے مختلف؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نے ابھی دنیا دیکھی ہی کہاں ہے؟"

"میں نے تو یہ جانا تھا کہ تم خاصی تجربہ کار اور کشتوں کے پشتے لگانے والی ہو"۔

"وہ بات اپنی جگہ پر درست ہے، مگر اس طرح نہیں، جس طرح تم سمجھتے ہو۔ میں مردوں سے نہیں بھاگتی ہوں۔ وہ خود مجھ سے بدک جاتے ہیں"۔

"آخر کیوں؟"

"یہ میں کیا جانوں۔ مرد عورت کو زیر پا کرنا چاہتے ہیں۔ جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی، تو اس احساس کے ساتھ پسپائی اختیار کرتے ہیں، جیسے کسی نے ان کو شکست فاش دے دی ہو۔ جب کہ درحقیقت ان کی پسپائی خود میری اپنی شکست کے مترادف ہوتی ہے"۔

"تم نے کہا تھا کہ تم طلاق شدہ ہو۔ قصوروار کون تھا؟"

" کوئی بھی نہیں۔ یہ ہمارا مشترکہ فیصلہ تھا۔ ہم بہت دنوں تک میاں بیوی کا ناٹک کھیلتے رہے تھے یا یوں کہو دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے تھے۔ دراصل میرے شوہر کو عورت کی نہیں ایک مرد کی ضرورت تھی"۔

"مغربی معاشرے میں انقلاب آیا چاہتا ہے۔ ہم جنس پرست کھلے بندوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر میاں بیوی کی طرح رہ رہے ہیں۔ مرد کی بیوی مرد اور عورت کا خاوند عورت۔ اس پر بس نہیں، ایسے جوڑے بچوں کو اپنا متبنیٰ بنانے لگے ہیں، جو دونوں میں سے کسی کے نطفے سے نہیں ہوتے۔ تمہارے بچے کتنے ہیں؟"

میں نے دیکھا کہ میرے سوال پر میشی لمحہ بھر کے لئے چکرا گئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس موضوع کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے کہا " بچے پیدا کرنے کے لئے مرد چاہیئے"۔

"ہاں یہ تو ہے۔مگر میں تصور بھی نہیں کرسکتا کہ تمہیں اس بھرے پرے معاشرے میں کوئی مرد نہیں مل پایا، جو اس سلسلے میں تمہارا ساتھ دے سکتا"۔

"مردوں کی مجھے کوئی کمی نہیں ہے۔تھوڑا عرصہ قبل میں نے اخبار میں دوستی کے کالم میں اشتہار چھپوایا تھا، جس کے جواب میں مجھے پینسٹھ خط ملے تھے۔ میں ان سب سے باری باری ملی ہوں اور ہر کسی کی دعوت کھائی ہے، مگر ان میں سے کوئی مرد مجھے پسند نہیں آیا۔ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ میں ان میں سے کسی کو اپنے ہونے والے بچے کا باپ بنانا پسند نہیں کرتی"۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری پسند پر اترنا بہت مشکل کام ہے"۔

ہم باتیں کرتے کرتے بندرگاہ میں پہنچ گئے تھے، جو شہر کے مرکز سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں پر تماشائیوں کا اس قدر جمگھٹا تھا کہ بھیڑ میں سے راستہ نکالنا دشوار تھا۔ بندرگاہ اس روز کشتیوں اور بحری جہازوں سے اٹی پڑی تھی۔ بندرگاہ کی سیر کرانے والی لانچیں ہر دو منٹ کے بعد چھوٹ رہی تھیں، جن میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے قطار میں لگنا پڑتا تھا، جو شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی۔ ہم نے اس قطار میں لگنے کی بجائے بلانکے نیزے جانے والی کشتی لینے کا ارادہ کیا، جو شہر میں چلنے والی اومنی بسوں کا حصہ ہے۔ بلانکے نیزے ہمبرگ کا ایک مضافاتی قصبہ ہے، جو دریا کے کنارے پر آباد ہے اور جہاں پر ساحلی علاقہ ایک ٹیلے کی طرح اوپر کو اٹھتا ہے۔ اس پر بنے ہوئے مکانات شہد کی مکھیوں کے چھتوں کی طرح پہاڑی سے چمٹے ہوئے ہیں، جن تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ سارا ماحول کسی پہاڑی صحت افزا مقام جیسا ہے، جس کے سبب ہمبرگ کے باسی وہاں پر اوٹنگ کے لئے جاتے ہیں۔ ایک طرف یہ نظارہ اور دوسری طرف وہاں پر دریا کا پاٹ اس قدر پھیلا ہوا اور پانی اتنا گہرا ہے کہ اس میں بڑے سے بڑا بحری جہاز چل سکتا ہے۔ ہمبرگ سمندر سے ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر ملک کے اندرونی حصے میں ہے، مگر دریائے ایلبے کی وسعت اور گہرائی کے سبب اس شہر کی بندرگاہ نہ صرف جرمنی کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے، بلکہ اس کا شمار یورپ کی مصروف ترین بندرگاہوں میں ہوتا ہے۔

ایلبے کے ساحل پر ایک میلوں لمبا راستہ سیر و سیاحت کے لئے بنا ہوا ہے، جس پر اس روز چلنے والوں کو دیکھ کر لگتا تھا، جیسے ہمبرگ کے سارے باسی وہاں پر گھوم پھر رہے تھے۔ اس راستے پر کیفے ہاؤسز کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ پایا جاتا ہے۔ کافی کی مہک اور تازہ کیک کی سوندھی خوشبو سیر کرنے والوں کو لبھاتی اور اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ میشی کی خواہش پر ہم ایک کیفے میں جا کر بیٹھے، مگر پائیں باغ کی

طرف کھلنے والے ایک کمرے میں۔ اس نے کہا اسے اچھا نہیں لگتا کہ سیر بین اس کی پلیٹ پر رکھے ہوئے کیک کے ٹکڑے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھیں اور کافی کے ہر گھونٹ کا گلے سے نیچے اترنے تک پیچھا کریں۔

میشی نے کہا: "تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا"۔

"تم میرے بارے میں کیا جاننا چاہتی ہو؟"

"مثلاً یہ کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟"

"میں فری لانسر ہوں اور کہانیاں لکھتا ہوں، جو میرے خوابوں پر مبنی ہوتی ہیں"۔

"مجھے خواب عام طور سے یاد نہیں رہتے۔ مگر آج رات کا خواب اب تک میرے ذہن میں کھلبلی مچائے ہوئے ہے۔ کچھ عرصے سے میں ایسے خواب تواتر سے دیکھنے لگی ہوں۔ کبھی ان کا تعلق اسکول کے امتحان سے ہوتا ہے، جو میں عرصہ ہوا پاس کر چکی ہوں اور کبھی ریل گاڑی سے، جو میرے سوار ہونے سے پہلے چھوٹ جاتی ہے۔ آج رات خواب میں میرا واسطہ ایک شخص سے پڑا تھا، جو مجھے اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا تھا، مگر اس میں ناکام رہتا ہے۔ اس کشمکش میں میری آنکھ کھل گئی اور میرا سارا پنڈا پسینے میں نہایا ہوا تھا"۔

"کیا تمہارے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آ چکا ہے؟"

"خود میرے ساتھ تو نہیں، مگر میری سہیلی کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔ اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے ہاتھوں، جو ہمارا ہمسایہ تھا۔ وہ قطعاً ناتجربہ کار تھی، اس لئے اس شخص کے پنجے میں پھنس گئی تھی۔ شرم کے مارے میں وہ کسی کو اس بارے میں نہیں بتاتی تھی۔ میں بھی خاموش رہی اور دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ ماں کو کچھ شبہ ہو گیا تھا، کیونکہ ہم دونوں نے ہمسایوں کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ میں سوچتی ہوں کہ مجھے اپنا منہ کھولنا چاہیئے تھا اور پولیس کے پاس رپورٹ کرنی چاہیئے تھی"۔

"آئے دن اخباروں میں ایسی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے یونیورسٹی کی ایک لڑکی کو شام کے وقت گھر کے راستے میں ایک مرد نے دبوچ لیا تھا۔ پہلے اس کے ساتھ زبردستی کی، پھر اس کو مار ڈالا تھا۔ سنا ہے کہ مجرم کو اب تک پکڑا نہیں جا سکا۔ لڑکیاں خود جان بوجھ کر اپنے آپ کو مشکلات میں ڈالتی ہیں۔ وہ اکیلی جنگل میں جوگنگ کرنے کے لئے جاتی ہیں۔ انہیں کوئی مت نہیں دے سکتا"۔

"ہم آزاد معاشرے کی شہری ہیں اور چاہتی ہیں کہ ہماری آزادی پر کوئی قید نہ لگائی جائے "۔

"اس آزادی کی قیمت بھی تو عورتوں کو بہت بھاری ادا کرنا پڑتی ہے"۔

"ہاں یہ تو ہے۔ آزادی مفت میں نہیں ملتی، اس کے لئے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے"۔

"یہ کیسی آزادی ہے، جس کے حصول کے لئے عورتوں کو عزت نفس کی قربانی دینی پڑے"۔

"میری سہیلی کی تو پوری زندگی برباد ہوگئی تھی۔ وہ اس واقعہ کے بعد اس قابل نہ رہی تھی کہ کسی مرد کے ساتھ مجامعت کر سکتی۔ اب تو عرصہ ہوا میں اسے آنکھوں سے کھو بیٹھی ہوں۔ مگر جب تک ہمارا آپس میں ملنا رہا، وہ مجھے یہی بتایا کرتی تھی کہ وہ کسی مرد کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے گھبراتی ہے۔ شادی کرنے کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی"۔

"تم نے کہا تھا کہ تمہارا خاوند صنف نازک کی بجائے مردوں میں دلچسپی رکھتا تھا۔ گویا تم اس کے ساتھ شادی شدہ ہوتے بھی اس کی طرف سے محفوظ تھیں"۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ میں نے اپنی سہیلی کا نام لے کر اپنی کہانی سنائی ہے، تو پھر تم غلط فہمی کا شکار ہو۔ میرے لئے اس کے ساتھ شادی شدہ ہونے کے بہت سے فائدے تھے۔ جب تک میں اس کے دوستوں کے بارے میں کچھ نہ کہوں، تب تک اس کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ میں کتنے مردوں کے ساتھ یاری لگاتی ہوں"۔

"اس پہلو سے میں نے اس معاملے پر غور نہیں کیا تھا۔ گویا مردوں کے سلسلے میں تم اچھی خاصی تجربہ کار ہو۔ شاید تم نے اسی لئے کہا تھا کہ تم کشتوں کے پشتے لگاتی جاتی ہو"۔

"ایسا بھی نہیں ہے کہ میں مردوں کو چولی کی طرح ہر روز بدلتی ہوں۔ دراصل میں بہت چناؤ پسند ہوں اور میری پسند پر اترنا آسان نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے اب تک دوسری شادی نہیں کی"۔

وہاں سے اٹھ کر ہم آگے شولاؤ جانے والی کشتی میں بیٹھ گئے، جہاں پر ہمبرگ کی بندرگاہ پر حاضری دینے والے جہازوں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ساحل دریا بنے ہوئے ایک ریستوراں میں ایک پاورفل لاؤڈ سپیکر سسٹم لگا ہوا ہے، جس پر ہر آنے اور جانے والے جہاز کے بارے میں معلومات نشر کی جاتی ہیں اور آنے والے جہازوں کو خوش آمدید اور جانے والے جہازوں کو خدا حافظ کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ ساری کاروائی ریستوراں میں بیٹھے ہوئے تماشائیوں کے لئے ہے، جن کا وہاں پر صبح سے شام تک جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ جہاز والوں تک تو شاید لاؤڈ سپیکر کی آواز بھی نہیں پہنچتی ہوگی اور اگر پہنچتی ہوگی، تو جہازوں کے عملے میں سے کتنوں کو جرمن آتی ہے، جس میں ساری کاروائی نشر ہوتی ہے

۔ ہمارا ارادہ وہاں پر اس ناٹک کو دیکھنے اور شام کا کھانا وہاں پر کھانے کا تھا۔ جس کے بعد ہم نے سویڈیش فلم ڈائرکٹر انگمار برگ من کی نئی فلم "بیاہی زندگی کے سین" دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا، جو ان دنوں ہمبرگ میں چل رہی تھی اور جس کا بہت چرچا تھا۔ میشی نے حسب سابق یہاں پر بھی ریستوراں کے بل کو سنبھال کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ بلکہ سنیما کے دونوں ٹکٹ بھی چیک کئے جانے کے بعد اپنے قابو میں کر لئے۔

فلم کی کہانی یہ تھی کہ خاوند اور بیوی دس برسوں سے شادی کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں، مگر ان کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو حل کرنے کی بجائے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ معاملہ یہاں تک پہنچتا ہے کہ دونوں کے لئے ایک دوسرے کی موجودگی ناقابل برداشت بن جاتی ہے۔ اس صورت حال میں دونوں اپنے اپنے طور پر گھر سے باہر دوست ڈھونڈتے ہیں اور اپنا وقت ان کی معیت میں گزارتے ہیں۔ جب وہ مکمل طور پر ایک دوسرے سے آزادی اختیار کر لیتے ہیں، تب کہیں جا کر یہ ممکن بنتا ہے کہ ان کے درمیان دوستی اور محبت کے جذبات از سرے نو پیدا ہوں اور وہ ایک دوسرے کو نہ صرف برداشت کرنے لگیں۔ بلکہ پھر سے چاہنے لگیں۔

فلم کا لیٹ شو کہیں آدھی رات کو جا کر ختم ہوا، جس کے بعد ہمیں گھر جانے کے لئے اپنی اپنی ریل گاڑیاں لینی تھیں، جو مخالف سمتوں میں جاتی تھیں۔ میشی کی گاڑی پہلے آئی اور میں نے اسے دن بھر کے پہلے اور آخری بوسے کے ساتھ اس میں سوار کرایا۔ اس دوران میں میری گاڑی بالمقابل والے پلیٹ فارم پر داخل ہو رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا پتا نوٹ نہیں کرایا اور نہ ہی فون نمبر دیا۔ اس کا اصل نام میرے لیے اسی طرح پوشیدہ رہا، جیسے اس کے لئے میرا نام۔ اس طرح ہماری پہلی اور آخری ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔

اگلے روز خبروں سے پتا چلا کہ گزشتہ رات ہمبرگ بندرگاہ کی سالگرہ سے لوٹنے والی ایک لڑکی کو کسی نے ہمبرگ کے ایک مضافاتی ریلوے اسٹیشن سے نکلتے ہوئے اغوا کر لیا تھا، جو وہاں پر پارک کی ہوئی اپنی کار میں سوار ہونے کے لئے پہنچی تھی۔ صبح کے وقت پولیس کو اس کی لاش شہر سے باہر ایک ویرانے میں ملی تھی۔ خبر میں لڑکی کا نام ماریا نے بتایا گیا تھا۔ میرے دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ وہ لڑکی کہیں میشی نہ ہو۔ مگر میں نے یہ کہہ کر دل کو تسلی دلا دی کہ اس کی طرح اس رات بے شمار دوسری لڑکیاں بھی اپنے گھروں کو لوٹی ہوں گی۔ پھر یہ بھی تھا کہ میں میشی کے اصلی نام سے ناواقف تھا۔ اور مجھے پتا نہ تھا کہ وہ شہر کے کس علاقے میں رہتی تھی۔

تیسرے روز اخبار میں قتل ہونے والی لڑکی کی تصویر چھاپی گئی، جو میرے خدشات کے مطابق میشی کی تصویر تھی۔ پولیس نے اس کے پرس میں پائے جانے والے ریستوراں کے بلوں، چینی کی تھیلیوں، کشتی اور سینما گھر کے ٹکٹوں کی مدد سے اس کی دن بھر کی نقل وحرکت کا نقشہ بنالیا تھا۔ بلکہ انہیں یہ پتا بھی چل گیا تھا کہ وہ اکیلی نہ تھی۔ مگر یہ بات ان پر نہ کھل سکی تھی کہ یہ دوسرا کون تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سارا دن اپنے قاتل کی معیت میں گھومتی پھری ہو۔ اس شخص کو چاہیئے کہ پولیس کے ساتھ رابطہ کرے اور اس کو دن بھر کی روداد بتائے۔ ممکن ہے کہ اس کی مدد سے قاتل کو تلاش کیا جاسکے۔

دوسری طرف مجھے یقین نہیں تھا کہ میں دن بھر کی روداد بتا کر قاتل کو تلاش کرنے میں مدد ثابت ہوسکتا ہوں۔ کیونکہ میری داستان وہاں پر ختم ہوجاتی تھی، جب میشی دمتوڑ ریلوے اسٹیشن پر سیٹی ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا بیتی تھی اور وہ کس طرح اپنے قاتل کے ہتھے چڑھی تھی، اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ پولیس کہیں مجھے قاتل نہ قرار دے دے۔ ایک بار پولیس کے پنجے میں پھنس جانے کے بعد نکلنا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس لئے میں نے دل میں طے کرلیا کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے، میں پولیس کے ساتھ رابطہ نہیں کروں گا۔ پولیس مہینوں تک تفتیش کرنے کے باوجود قاتل کو تلاش نہ کرپائی اور آخرکار میشی کے قتل کا معاملہ داخل دفتر کردیا گیا۔

اس دوران میں نئے سائنسی تجربات کی مدد سے یہ امر ممکن بن گیا ہے کہ مجرموں کی DNA کا تجزیہ کرکے ان کا ایسے معاملات میں ملوث ہونا حتمی طور پر ثابت کیا جاسکے۔ چنانچہ کچھ عرصے سے ہمبرگ کا متعلقہ محکمہ ایسے تمام جرموں کی جانچ پڑتال میں لگا ہوا ہے، جو پہلے وقتوں میں اس لئے داخل دفتر کردیئے گئے تھے کہ مجرموں کے خلاف ثبوت مہیا نہ کیا جاسکا تھا۔ میشی کے قتل کے کیس میں ملوث مجرم کو اس وقت تو پکڑا نہ جاسکا تھا، مگر بعد میں ایک دوسرے کیس میں اس کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔ اس کی DNA کا جب میشی کے جسم پر پائے جانے والی DNA سے موازنہ کیا گیا، تو ان کا ایک ہونا ثابت ہوگیا۔

جب سے میں نے یہ خبر سنی ہے کہ قاتل کو بالآخر تیس برسوں کے وقفے کے بعد DNA کی مدد سے شناخت کرلیا گیا ہے، تب سے میرے دل پر سے ایک بوجھ اتر گیا ہے، جو اتنے برسوں سے مجھے پیس رہا تھا۔ اس سارے عرصے میں کوئی دن نہیں گزرا، جب میرے ضمیر نے ملامت نہیں کی اور مجھے بزدلی کا طعنہ نہیں دیا۔

(کمرفیلڈ۔ ۲۶ جون ۲۰۰۶ء)

امانت

سرینی کا فون سویرے سویرے آیا۔ مجھے ایک عمر سے پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں پر ہوتی ہے اور کیا کرتی ہے۔ آواز بہت دھیمی تھی اور کسی عمر رسیدہ عورت کی لگتی تھی، جو اگر مر نہیں گئی تھی تو زندہ بھی نہیں تھی۔ اس لئے میں پوچھ بیٹھا کہ وہ کس قبرستان سے بول رہی ہے اور یہ کہ اسے مرے ہوئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟ مجھے پتا تھا کہ یہ بات غیر مہذب ہے، مگر مجھے اس بے تکلفی کے سبب، جو ایک زمانے میں ہمارے درمیان ہوا کرتی تھی، پتا تھا کہ سیرینی میری بے ادبی کا برا نہیں مانے گی۔ اور سچ مچ اس نے جواب دیا کہ اسے میرے جائے مدفن کا پتا تلاش کرنے کے لئے کہاں کہاں نہیں جانا پڑا تھا۔ اکثر رجسٹروں میں سے میرا نام کٹ چکا تھا اور خود ٹیلی فون ڈائرکٹری میں بھی اس کا اندراج نہیں تھا۔ محض اتفاقی طور پر اسے انٹرنیٹ میں گوگل کی مدد سے میرا اتا پتا لگانے میں کامیابی ہوئی تھی۔ پھر اس نے اضافہ کیا کہ اگر تم مجھے تلاش کرنے کے لئے نکلتے تو گوگل بھی تمہارے کام نہ آتا، کیونکہ میں گم نامی کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ مجھے خود پتا نہیں ہے کہ میں کہاں پر ہوتی ہوں اور زندہ بھی ہوں یا مر چکی ہوں۔

ہماری دوستی طالب علمی کے زمانے سے ہے۔ اس سے پہلی بار ملنا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ سرما کے سمسٹر کا پہلا دن تھا اور سمینار کے میٹنگ روم میں پچاس ساٹھ کے لگ بھگ طالب علم جمع تھے۔ میں جس شعبے میں پڑھتا تھا، اس میں یہ رسم چلی آتی تھی کہ سمسٹر شروع ہونے والے روز استاد اور طالب علم وہاں پر جمع ہوتے تھے اور آپس میں لیکچروں اور سمیناروں کے اوقات طے کرتے تھے۔ پڑھانے والے باری باری سٹیج پر آتے تھے اور اپنے لیکچروں کے اوقات کے بارے میں طالب علموں سے گویا سودا بازی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ اگر اپنے لیکچر کے لئے سوموار کا دن اور پانچ بجے کا وقت تجویز کرتے تھے، تو یقیناً کسی کونے سے احتجاج کی آواز بلند ہوتی تھی، کیونکہ اس روز کسی دوسرے شعبے میں عین اسی وقت پر کوئی دوسرا لیکچر رکھا گیا ہوتا تھا، جس میں اس طالب علم کی شمولیت اشد ضروری

تھی۔ وہ کوئی دوسرا وقت یا دن تجویز کرتا تھا، جو بدقسمتی سے دوسرے طالب علموں کے لئے غیر مناسب نکلتا تھا۔ یہ لین دین اس وقت تک جاری رہتی تھی، جب تک کوئی ایسا دن اور وقت نہ طے کرلیا جاتا تھا، جو اس لیکچر کو سننے کے خواہشمندوں کی اکثریت کے لئے قابل قبول ہوتا تھا۔ واضح ہے کہ اس محفل میں شمولیت سب کے لئے اہمیت رکھتی تھی۔ جو کوئی وہاں پر حاضر نہ ہوسکتا تھا، اس کو دوسروں کے طے شدہ شیڈول کے مطابق اپنا پروگرام بنانا پڑتا تھا۔

اس محفل میں شامل ہونے کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا، جو اتنا ہی اہم تھا۔ اس روز شعبے کے تمام نئے اور پرانے طالب علم ایک جگہ پر جمع ہوتے تھے، جن کے ساتھ دوسرے دنوں میں ملنے کے امکانات کم ہوتے تھے، کیونکہ ہر کسی کو اپنے اپنے لیکچروں میں شامل ہونا ہوتا تھا، جن کے اوقات دوسروں سے اکثر مختلف ہوتے تھے۔ بالخصوص پہلی بار شامل ہونے والے نئے طالب علموں کو ایک نظر دیکھنے کا اس سے بہتر موقعہ اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اس روز نئے طالب علموں میں مجھے ایک بڑی پیاری چھوئی موئی سی لڑکی نظر آئی، جس کی حیرت زدہ نیلی آنکھیں اپنے گردوپیش کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے سینے پر لگے ہوئے نام کے ٹیگ پر سرینی لکھا ہوا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ نام کسی قدر عجیب مگر خوبصورت ہے۔

محفل کے خاتمے پر میں اسے گھیر گھار کر کیفے ٹریا میں لے گیا۔ وہ نئی نئی ہمبرگ میں وارد ہوئی تھی اور ابھی کمرے کی تلاش میں تھی۔ چونکہ ہوسٹلوں میں داخلہ ملنے کی معیاد گزر چکی تھی، اس لئے وہ پرائیویٹ کمرہ ڈھونڈ رہی تھی۔ میں نے اس بارے میں اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ ہفتے کے روز مقامی اخبار میں خالی کمروں کے اشتہار چھپتے تھے۔ البتہ اچھے اور سستے کمرے عام طور سے بہت جلد نکل جاتے تھے، کیونکہ ہوشیار لوگ جمعے کے روز نصف شب کو اخبار کے دفتر سے اگلے روز کا پرچہ حاصل کر کے سویرے سویرے کمرہ دیکھنے کے لئے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ سرینی کے ساتھ یہ طے پایا کہ ہمیں بھی اسی طرح کمرہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ہم جمعے کی رات کو اخبار کے دفتر چلے جائیں، پھر وہیں کہیں پر بیٹھ کر اشتہارات دیکھیں اور پسند آنے والے کمروں کے مالکان کو اگلے روز صبح سویرے فون کریں۔ اس زمانے میں ابھی سیل فون ایجاد نہیں ہوا تھا، جسے آج کل ہر کوئی اٹھائے پھرتا ہے۔ ہمیں فون کرنے کے لئے ڈاک خانے یا کسی پبلک فون بوتھ پر جانا تھا، جہاں پر عام طور سے فون کرنے کے خواہشمندوں کی قطار لگی ہوتی تھی۔ پھر اسی پر بس نہیں تھی۔ فون پر مالکان سے کمرہ دیکھنے کی خاطر ان کا ایڈریس حاصل کرنے کے بعد جلد از جلد وہاں پر پہنچنا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں

طالب علموں کے پاس کاریں تو ہوتی نہیں تھیں، اس لئے انڈر گراونڈ ٹرین یا ٹرام وے پر سفر کرنا پڑتا تھا، جس پر اچھا خاصہ وقت لگ جاتا تھا۔ پھر جو کوئی پہلے پہنچ جاتا تھا، وہ کمرہ لے اڑتا تھا اور دوسرے منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔

پہلے ہفتے ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ دوڑ دھوپ کے باوجود ہمیں کوئی مناسب کمرہ نہ مل سکا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ہمیں مالکان مکان کا دل پسیجنے کے ڈھنگ کے سلسلے میں تھوڑا سا تجربہ ہو گیا۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے نتیجے میں ہمیں اگلے ہی ہفتے ایک بوڑھی عورت کے فلیٹ میں ایک کمرہ مل گیا۔ پہلے تو اس نے جانا کہ ہم دونوں مشترکہ کمرہ لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس نے کہا کہ اس کا کمرہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ اس میں دو بستر لگ سکتے ہوں۔ مگر ہم نے اسے بتایا کہ میں دوسری جگہ پر مقیم ہوں اور وہ کمرہ ہمیں صرف سرینی کے لئے چاہیئے، جو ہمبرگ میں نئی نئی وارد ہوئی تھی۔ بڑھیا نے کہا کہ اگر میں سرینی کو ملنے کی خاطر آنا چاہوں، تو اسے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ البتہ مجھے شام کے دس بجے کے بعد وہاں پر ٹھیرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس پر ہم دونوں ہنس دیئے، کیونکہ ہمارے تعلقات اس نوعیت کے نہیں تھے، جو ہماری شامیں اکٹھی گزرتی ہوں۔

میں نے آئندہ دنوں میں سرینی کو سٹی گائیڈ بن کر شہر اور قرب و جوار کے علاقے کی سیر کرائی۔ البتہ اس کام کے لئے میرے پاس وقت صرف ویک اینڈ پر نکل سکتا تھا، کیونکہ مجھے یونیورسٹی میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری کر کے روزی کمانی ہوتی تھی، جس کے لئے بہت تگ و دو کرنی پڑتی تھی۔ یونیورسٹی کے لیبر ایکسچینج کی معرفت کبھی کام مل جاتا تھا اور کبھی نہیں مل پاتا تھا۔ سرینی کو پیسے گھر سے آ جاتے تھے، البتہ اتنے کھلے نہیں ہوتے تھے کہ وہ امیر گھرانوں کے طالب علموں کی ہمسری کر سکے۔ اس لئے وہ بھی گاہے بگاہے کوئی چھوٹی موٹی جاب کرتی رہتی تھی۔ جب کہ اس کے مقابلے میں مجھے بعض اوقات بندرگاہ میں بحری جہازوں پر سامان لادنے یا اتارنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک بار جنوبی امریکہ سے آنے والے ایک جہاز پر سے کیلوں کے گچھے اتارتے ہوئے مجھے ایک ساتھی نے بال بال موت سے بچایا تھا، جس نے اس گچھے میں سے ایک سانپ کو نکلتے اور میرے سر پر لہراتے ہوئے دیکھ لیا تھا، جسے میں اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ آج کل کیلے کٹے کٹائے کارٹن میں بند ہو کر آتے ہیں، جب کہ اس زمانے میں پورے پورے ہرے گچھے بھیج دیئے جاتے تھے، جو بیس تیس کلوگرام کے ہوتے تھا اور جن کو ایک ایک کر کے اٹھا کر لے جانا ہوتا تھا۔ ہمیں کسی نے نہیں بتایا تھا کہ ان میں بعض اوقات سانپ یا دوسرے

موزی کیڑے مکوڑے بھی پائے جاتے ہیں۔ البتہ ہم نے دیکھا تھا کہ بندرگاہ پر مزدوری کرنے والے دستانے پہنتے تھے اور اپنی پیٹھ پر چمڑے کا ایک پارچہ باندھتے تھے۔ ہمیں اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ بندرگاہ میں کام کرنے کی مزدوری کے علاوہ کپڑوں کی صفائی کے لئے علیحدہ الاؤنس ملتا تھا۔ صرف یہی نہیں مجھے تو ایک بار وہاں سے نئی عینک کے لئے پیسے بھی ملے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ بنگال سے آنے والے ایک جہاز پر سے چائے کی پیٹیاں اتارتے ہوئے میری عینک دھکچہ لگنے کے سبب ٹوٹ گئی تھی۔ اس بات کی رپورٹ انچارج ڈیوٹی کے پاس کی گئی، تو اس نے کہا کہ بندرگاہ میں کام کرنے کے دوران پیش آنے والے حادثات کا اجتماعی بیمہ ہوتا ہے اور متعلقہ انشورنس کمپنی کو عینک کے اخراجات ادا کرنے ہوں گے۔ چنانچہ مجھے دوسرے ہی روز نئی عینک کے لئے پیسے مل گئے تھے اور میں اپنی ٹوٹنے والی عینک سے بڑھیا عینک خرید پایا تھا۔

مجھے ایک بار ایک پرنٹنگ پریس میں رات کی شفٹ پر کام ملا، بلکہ اپنے کسی دوست کو ساتھ لانے کو کہا گیا، کیونکہ کام ایک آدھ آدمی کے بس کا نہ تھا۔ میں نے سرینی سے بات کی، تو وہ فوراً میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگئی۔ ہمیں ویک اینڈ کی دونوں راتوں کو وہاں پر کام کرنا تھا۔ پریس میں کام کی زیادتی کے سبب ایک فرم کے بروشر وقت پر نہ چھاپے جا سکے تھے۔ ہمیں یہ تو پتا تھا کہ ویک اینڈ پر کام کا معاوضہ عام دنوں سے دوگنا ملتا ہے اور پھر رات کی شفٹ کے لئے ایکسٹرا سرچارج ادا کیا جاتا ہے۔ گویا صرف دو راتوں پر کام کرنے کے نتیجے میں ہمیں قریب قریب پورے ہفتے کا معاوضہ ملنے کی امید تھی۔ پھر جب ادائیگی کا وقت آیا، تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہمیں پوری رقم ٹیکس کی کٹوتی کے بغیر ادا کر دی گئی، جب کہ عام طور سے مزدوری پر ٹیکس لگتا تھا، جو اچھا خاصا ہوتا تھا۔ پتا چلا کہ ویک اینڈ پر راتوں کی شفٹ پر کام کرنے پر ٹیکس نہیں لگتا۔ یہ دیکھ کر ہم نے سوچا کہ اب صرف رات کی شفٹ پر کام تلاش کریں گے، بلکہ ممکن ہو تو ویک اینڈ کی راتوں میں۔ یہ پروگرام بنا لینا تو آسان تھا، مگر اس پر عمل درآمد مشکل ثابت ہوا۔ پتا چلا کہ رات کی شفٹوں پر کام کرنے کے خواہشمندوں کی تعداد ساحل سمندر پر پائے جانے والے ریت کے ذرات کی طرح بے حد و حساب تھی۔

انہی دنوں میں سرینی کو ایک اور کام مل گیا، جس میں خوب آمدن ہو جاتی تھی۔ وہ ایک پب میں شام کی شفٹ پر ویٹریس بن گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس بات کی اس قدر شہرت ہوئی کہ دور دور سے شرابی خاص طور پر سرینی کو دیکھنے اور اس کے ہاتھوں سے شراب کا جام لینے کے لئے آنے لگے۔ اکثر و بیشتر وہ

لوگ اپنے حساب پر سرینی کو بھی شراب پینے کی دعوت دینے لگے، جس کو سرینی رد کرنے کی جرات نہ رکھتی تھی۔ اس کے پیچھے اس کا یہ لالچ بھی تھا کہ گاہکوں کی بات مان لی جائے، تو وہ اچھی ٹپ دیں گے۔ اس کو ٹپ تو خیر ملنی ہی تھی، مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ اچھی خاصی شراب کی رسیا بنتی جارہی تھی، جب کہ وہ ایک بہت کٹر مذہبی خاندان سے تھی، جس میں شراب کا استعمال صرف چرچ کے اندر کمیونین کے لئے جائز تھا۔ اس بارے میں اس نے خود مجھے بتایا تھا۔ دراصل مجھے اس کے خاندانی نام اوگلوی کے بارے میں جاننے کا شوق تھا، کیونکہ یہ جرمن نام نہیں ہے۔

سرینی نے بتایا کہ اس کے خاندان کا آبائی وطن دراصل آئرلینڈ تھا، جہاں سے اس کے پردادا کو مذہبی وجوہات کی بنا پر ہجرت کرنی پڑی تھی۔ آئرلینڈ صدیوں سے کیتھولک چرچ کا گڑھ ہے، جب کہ اس کا خاندان اٹھارہویں صدی میں پروٹسٹنٹ تحریک میں شامل ہوگیا تھا۔ اس چیز کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑا تھا۔ جب آخر کار حالات ناقابل برداشت ہوگئے اور اس کے خاندان کا اقتصادی طور پر ناطقہ بند کر دیا گیا، تو اس کا پردادا اپنے لمبے چوڑے کنبے سمیت وطن کو خیر باد کہہ کر جرمنی چلا آیا تھا۔ یہاں پر ان کو جس شہر میں سر چھپانے کو جگہ ملی، وہاں پر بھی کیتھولک چرچ کا زور تھا۔ مگر اس ملک میں بہت حد تک رواداری کا رواج ہو چکا تھا۔ مذہبی جنگوں کا زمانہ عرصہ ہوا لد چکا تھا۔

سرینی کے ماں باپ مذہبی خیالات رکھتے تھے اور اپنی اکلوتی بیٹی کو بھی اپنے رنگ میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ اس لئے اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ وہ تو اس کو اسکول میں داخل ہی نہیں کرانا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے چار برسوں تک اسے اسکول نہیں جانے دیا۔ جب بھی مقامی انتظامیہ کی طرف سے اس مضمون کی چٹھی آتی تھی کہ اپنی بیٹی کو اسکول میں داخل کرائیں، تو وہ اس کے خلاف اپیل کر دیتے تھے۔ بلکہ نوبت مقدمہ بازی تک پہنچی۔ چونکہ جرمنی میں قانونی طور پر بچوں کو اسکول بھیجنا ہوتا ہے، اس لئے عدالت نے فیصلہ ان کے خلاف کر دیا۔ اور یہ دھمکی دی کہ اگر اس حکم کی خلاف ورزی کی گئی، تو ان کو تربیت اولاد کے لئے نااہل قرار دے کر بیٹی ان سے چھین لی جائے گی۔ اس سرکاری زبردستی کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد بھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کو بیٹی کو سرکاری اسکول میں داخل کرایا جائے۔ اس ملک میں کئی قسم کے پرائیویٹ اسکول بھی پائے جاتے ہیں، جہاں پر بچوں کی تعلیم و تربیت مذہبی نقطہ نظر کے تحت یا کسی دوسری فلاسفی کے زیر اثر ہوتی ہے۔ ان کے شہر میں روڈولف شٹائنر کا والڈ ڈورف اسکول موجود تھا، جہاں پر بچوں کو دنیاوی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ موسیقی، مصوری اور دوسرے

فنون لطیفہ کا باقاعدہ درس دیا جاتا تھا۔ان کے مدرسوں میں صرف لکھنا پڑھنا ہی نہیں سکھایا جاتا، بلکہ ان کے دعوے کے مطابق ایک مکمل انسان تیار کیا جاتا ہے۔سرینی کو ہر قسم کے ڈانس آتے تھے۔وہ کلاسیکی موسیقی کی دلدادہ تھی اور شعروشاعری اس کی رگ رگ میں رواں تھی۔مگر کیا وہ ایک مکمل انسان بھی تھی؟

اس چیز کے امتحان کا وقت بہت جلد آ گیا۔سرینی کو اکیلی دکیلی ایک بوڑھی عورت کے پاس رہنا بالکل پسند نہ آیا۔وہ بائیں بازو کے طالب علموں کے کسی ایسے گروپ کی تلاش میں تھی، جو باہم مل جل کر اکٹھے رہتے ہوں۔اس کا خیال تھا کہ یہ چیز خاندان کا نعم البدل ثابت ہوسکتی ہے۔مجھے پتا تھا کہ ایسے گروپ ماضی میں ناکام ہو چکے تھے۔مگر سرینی اس بارے میں کسی کا مشورہ نہیں سننا چاہتی تھی۔اس کا خیال تھا کہ میں اس کو اس لئے گروپ کے مشترکہ فلیٹ میں منتقل ہونے سے روکنا چاہتا تھا، کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ وہاں پر کہیں کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ منسلک نہ ہو جائے۔اگر وہ ایسا کرنا چاہتی تھی،تو میں اس بارے میں بھلا کیا کرسکتا تھا۔میں نے مشترکہ فلیٹوں میں رہنے والوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ان فلیٹوں میں کسی کو ذاتی ملکیت رکھنے کی اجازت نہیں تھی اور وہاں پر ہر چیز سانجھی ہوتی تھی، جس کو ہر کوئی استعمال میں لاسکتا تھا۔اس اصول کا اطلاق مرد وعورت کے باہمی جنسی تعلقات پر بھی ہوتا تھا۔ہر کوئی ہر کسی کے ساتھ ہم بستری کرسکتا تھا۔

مجھے ایک بار ان کی ایک شبینہ پارٹی میں شامل ہونے کا موقعہ ملا،جس میں بارہ چودہ لڑکیاں اور اتنے ہی لڑکے شامل ہوئے تھے۔میں نے دیکھا کہ ان میں قدر مشترک ایک قسم کا لاابالی پن تھا۔پڑھنے لکھنے میں وہ کچھ ایسی زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔البتہ ہر اس جگہ پر پہنچ جاتے تھے، جہاں پر شور شرابا برپا ہوتا تھا۔یوں کہنے کو وہ سارے بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے اور امریکہ کے مقابلے میں ویت نام کے حامی تھے اور ہو چی من کے حق میں نعرہ بازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔مگر صحیح معنوں میں مزدوروں کے ساتھ ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ اکثر کھاتے پیتے گھرانوں کے سپوت تھے،جن کا سوشلزم دراصل ایک قسم کا فیشن تھا۔اس گروپ کی لڑکیاں فلسطینیوں کی حمایت کا اظہار کرنے کے لئے ویسا اسکارف استعمال کرتی تھیں،جیسا یاسر عرفات اپنے سر پر باندھا کرتا تھا۔یہ سب کچھ بہت سطحی سا تھا،جس کا اظہار قدم قدم پر ہوتا تھا۔

مشترکہ فلیٹ میں منتقل ہونے کے تھوڑے دنوں کے اندر اندر مجھے سرینی میں نمایاں تبدیلیاں نظر آنی لگیں۔اس نے سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی، جو اس کے ماں باپ کے ہاں سختی سے منع تھی۔پھر

پتا چلا کہ اس نے دوسروں کی دیکھا دیکھی LSD کھانے کی لت بھی ڈال لی تھی۔ اس زمانے میں اس نشہ آور دوائی کا استعمال بائیں بازو کے طالب علموں میں کسی وبائی مرض کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں سے نکل کر یہ نشہ آور دوائی یورپ کے تعلیمی اداروں کو فتح کر رہی تھی۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ سرینی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے پر تلی ہوئی ہے اور کوئی شخص اس کو اس بے وقوفی سے باز نہیں رکھ سکتا۔ یوں بھی میں اس کا نگران یا سرپرست نہیں تھا، جو اس معاملے میں دخل اندازی کا حق رکھتا ہو۔ میں نے اس کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا اور وہ دھیرے دھیرے میری زندگی میں سے نکل گئی۔

☆☆☆

اب اتنے برسوں کے بعد سرینی کا فون آیا، تو طبعاً میرے دل میں یہ جاننے کا شوق پیدا ہوا کہ ہمارا رابطہ ٹوٹ جانے کے بعد اس کی زندگی کیسی گزری تھی اور کیا اسے ویسی بے فکری اور خوشحالی نصیب ہوئی تھی، جس کے خواب وہ اس زمانے میں دیکھا کرتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ انسان اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ دن رات جان ماری کرتا پھرے اور زندگی بھر دوسروں کی چاکری کرے۔ وہ کسی قسم کی ملازمت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دراصل وہ انسانی معاشرے کو خیر باد کہنا چاہتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ کہا کرتی تھی۔ زمین کی گردش کو روکو، میں اتر جانا چاہتی ہوں۔ اس لئے میں نے پوچھا کہ کیا اسے زندگی کے چکر پر سے اترنے میں کامیابی ہوئی تھی؟ اور کیا وہ اب تک اتری ہوئی تھی؟

اس نے جواب دیا۔ کہاں کامیابی ہوئی تھی۔ یہ معاشرہ کسی کو اپنی گاڑی پر سے اترنے نہیں دیتا۔ وہ کسی سخت گیر باپ کی طرح اپنے بچوں کو بازوؤں میں جکڑے رکھتا ہے۔

پتا چلا کہ سرینی اپنی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر ایک دوست کے ہمراہ ہندوستان چلی گئی تھی۔ ان کا ارادہ وہاں پر شری راجنیش کے چرنوں میں جا کر بیٹھنے کا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہاں پر ان کے سارے سوالات کا جواب مل جائے گا۔ ان کی طرح مغربی دنیا کے دوسرے ملکوں سے بھی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بہت بڑی تعداد میں جمع تھیں۔ اشرام میں کسی میلے کا سا سماں تھا، جہاں پر ہر قسم کی آزادی تھی۔ سب کے لئے کھانے پینے کا انتظام تھا۔ چرس اور بھنگ کے ساتھ ساتھ LSD کھلے بندوں مل جاتی تھی۔ سرینی نے کہا کہ اگر کہیں پر ارضی جنت پائی جاتی ہے، تو وہ وہاں پر موجود تھی۔ مگر بدقسمتی سے ان کی

جمع شدہ پونجی چھ ماہ میں خرچ ہوگئی اوران کووطن لوٹنے کے لئے سفارت خانے سے قرض لینا پڑا۔

میں نے پوچھا۔کیا جرمنی میں کسی نے تمہیں کھلے بازوؤں کے ساتھ خوش آمدید کہا تھا؟

سرینی نے ہنس کر کہا۔میرے ماں باپ زندہ تھے،مگر میں ان کے پاس جا کر نہیں رہ سکتی تھی۔ یوں بھی میں ان کی نظروں میں مذہبی بھگوڑا تھی، جوان کی توقعات پر پوری نہیں اتری تھی اور جس نے ان کے آدرش کو توڑا تھا۔اس لئے ہمیں ملک کی سوشل سیکورٹی سے امداد لینی پڑی تھی، جو مرنے کے لئے بہت مگر جینے کے لئے کہیں تھوڑی تھی۔

میں نے کہا۔تمہارے راستے میں شاید یہ چیز بھی حائل تھی کہ تم نوکری کرنے سے انکاری تھیں۔

سرینی نے کہا۔یونیورسٹی کی تعلیم میں نے مکمل نہیں کی تھی اور سوائے اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کے میرے پاس کوئی ڈگری بھی تو نہیں تھی۔پھر یہ بھی تو تھا کہ میں حمل سے تھی اور بہت جلد ماں بننے والی تھی۔ تم جانتے ہو کہ سات ماہ کی حاملہ کو کوئی ملازمت نہیں دیتا۔

میں نے کہا۔کیا تمہارے دوست کو بھی ملازمت نہیں مل سکتی تھی؟ آخر وہ تمہارا شریک حیات تھا اور ہونے والے بچے کا باپ تھا۔

سرینی نے کہا۔میں اس سے کسی قسم کی امید نہیں رکھ سکتی تھی۔یوں بھی اسے پتا تھا کہ وہ میرے ہونے والے بچے کا باپ نہیں ہے۔دراصل وہ نامرد تھا اور اسی چیز پر ہماری دوستی کی بنیاد تھی۔ہمارے ہندوستان جانے اور شری راجنیش کے اشرم میں پناہ لینی کے وجہ یہی تھی۔اس کا خیال تھا کہ وہاں پر اس کو مردانہ قوت دی جائے گی۔مگر ہوا اس کے الٹ۔اس کی رہی سہی مردانگی بھی وہاں پر لٹ گئی۔ہپیوں کے ایک گروپ نے، جو ہم جنس پرست تھے،اس کو اپنی جورو بنالیا اور چھ ماہ میں اس کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی۔ہمیں وہاں سے بمشکل جان بچا کر بھاگنا پڑا تھا۔

میں نے کہا۔تمہارے دوست کی نامردگی ملازمت حاصل کرنے میں اس کا راستہ تو نہیں روک سکتی تھی۔اس زمانے میں جرمنی میں ہر کسی کو چھوٹی موٹی نوکری مل جاتی تھی۔کیا وہ بھی تمہاری طرح ملازمت کرنے سے انکاری تھا؟

سرینی نے کہا۔ملازمت تو دور کی بات ہے، اس کا دل کسی بھی کام میں نہیں لگتا تھا۔اور باقاعدگی سے ہر روز صبح سویرے اٹھنا اور وقت پر کام پر جانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔اس لئے وہ اس چیز کے خواب دیکھا کرتا تھا کہ اس کی لاٹری نکل آئے یا وہ کسی روز چپکے سے کوئی بنک لوٹ لے۔

میں نے کہا۔ پھر کیا اس کی لاٹری نکلی تھی یا بنک پر ڈاکہ ڈالنا پڑا تھا۔

سرینی نے کہا۔ بنک پر ڈاکے ڈالنے کے دوران وہ پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ میں بھی اس روز اس کے ساتھ گئی تھی، مگر مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ بنک پر ڈاکہ ڈالنے جا رہا ہے۔ مجھے اس نے ایک جگہ پر کار روکنے اور اس میں بیٹھے رہنے کو کہا تھا۔ اس نے کہا تھا موٹر بند نہ کرنا میں بس دو منٹوں میں لوٹ رہا ہوں۔ مگر معاملہ بگڑ گیا۔ پولیس موقعے پر پہنچ گئی تھی اور اس نے بنک کا محاصرہ کر لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ڈاکہ ڈالنے والے کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اصلی ہے، جس کو اس نے بنک کے ایک کارکن کے سر پر تان رکھا تھا۔ دراصل وہ محض پلاسٹک کا کھلونا تھا۔ پولیس نے اس پر فائر کئے اور وہ موقعے پر مارا گیا۔ میں اس سارے قصے سے بے خبر کار میں بیٹھی ہوئی اس کی راہ تکتی رہی تھی۔ بنک وہاں سے دو گلیاں چھوڑ کر واقع تھا، اس لئے مجھے بالکل پتا نہ چل سکا کہ اس کے ساتھ کیا بیتی تھی۔ جب وہ آدھ پون گھنٹے تک واپس نہ لوٹا، تو میں اس کو ڈھونڈنے گئی۔ پولیس کے دستے ہر طرف کھڑے تھے اور وہ کسی کو بنک کی طرف نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور میں معاملے کی تہہ کو پہنچ گئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ کیا تم پر بھی الزام آیا تھا؟

سرینی نے کہا۔ مجھے اس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی تھی، مگر چونکہ میرے خلاف کوئی ثبوت پیش نہ کیا جا سکا، اس لئے میں صاف بچ گئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ اس حادثہ کے بعد تمہاری زندگی کیسی گزری؟

سرینی نے کہا۔ مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے بہت جدوجہد کرنی پڑی۔ اگر میرے ماں باپ بچے کو سنبھالنے کے سلسلے میں میری مدد نہ کرتے، تو میں اکیلی کبھی اس میں کامیاب نہ ہوتی۔ مجھے دو جانوں کے لئے روزی کمانی تھی اور پھر بیٹے کی پرورش اس طرح کرنی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں میری غلطیوں کو نہ دھرائے۔

میں نے کہا۔ یہ احساس تمہیں کب جا کر ہوا کہ تم نے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ڈبویا تھا؟

سرینی نے کہا۔ میں اس بات کو ہمیشہ سے جانتی تھی، مگر اس چیز کو کھلے بندوں تسلیم کرنے کے لئے جتنی جرات درکار ہے، وہ میرے اندر نہ تھی۔

میں نے کہا۔ صبح کا نکلا ہوا شام کو گھر آ جائے تو اسے گمشدہ نہیں کہتے۔

سرینی نے کہا۔ مجھے آج تک گھر کی طرف جانے والا راستہ ہی نہیں ملا۔ میں عمر بھر شہر میں بھٹکتی

پھری ہوں۔اور پھر میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا تھا، جس نے مجھے جیتے جی مار ڈالا۔

میں نے پوچھا۔کیسا حادثہ؟

سرینی نے کہا۔سڑک پار کرتے ہوئے میں ایک موٹر سائیکل سے ٹکرا گئی تھی، جس کے بعد مجھے کچھ پتا نہیں چلا کہ کہاں ہوں اور زندہ بھی ہوں یا نہیں۔جب میری آنکھ کھلی، تو اس دوران میں دس برس گزر چکے تھے اور میں ایک ہسپتال کے سپیشل کیر وارڈ میں پڑی ہوئی تھی۔میرا بیٹا، جو حادثے کے وقت نو برس کا تھا، اب انیس برس کا ہو چکا تھا۔میرا باپ اس دوران میں مر گیا تھا۔البتہ میری ماں نے اس سارے عرصے میں ہمت نہیں ہاری تھی۔اس نے میرے بیٹے کو پالا پوسا اور ہسپتال کے ساتھ مجھے زندہ رکھنے کے سلسلے میں جنگ لڑی۔اس کو پورا پورا یقین تھا کہ اس کی بیٹی ایک روز اپنی آنکھیں کھولے گی۔ دراصل میری آنکھیں سارا وقت کھلی تھیں، صرف مجھے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔میں زندہ درگور تھی۔اگر ڈاکٹروں کا بس چلتا، تو وہ خوراک رسانی کا انتظام کبھی کا بند کر چکے ہوتے۔مگر میری ماں نے کہا کہ وہ ایسا نہیں کرنے دے گی۔یہ معاملہ عدالت کے سامنے گیا، جہاں پر میری ماں کی جیت ہوئی۔اگر وہ مقدمہ ہار جاتی، تو میں کبھی کی قبرستان میں دفن ہو چکی ہوتی اور تمہیں میرے مرنے کا پتا بھی نہ چلتا۔

میں نے کہا۔مجھے تمہارے حادثے کی خبر ہو جاتی، تو میں ضرور تمہیں دیکھنے کے لئے آتا اور تمہاری ماں کا ہاتھ بٹاتا۔آخر مجھے تم سے ایک زمانے میں پیار تھا۔

سرینی نے کہا۔تمہیں شاید یاد ہو گا کہ تم نے مجھے ایک انگوٹھی بھی دی تھی، جو تمہیں راستے میں کہیں پر گری پڑی ہوئی ملی تھی۔تم نے کہا تھا اسے منگنی کی انگوٹھی سمجھو۔جب ہم شادی کریں گے، تو میں تمہارے لئے نئی انگوٹھی خریدوں گا۔پچھلے دنوں اپنے سامان کی چھانٹی کرتے ہوئے وہ انگوٹھی میرے ہاتھ لگ گئی تھی، جس نے میرے دل میں تمہاری یاد تازہ کرا دی۔دراصل میں تمہاری امانت واپس کرنے کے لئے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔

(کمر فیلڈ۔۳۱ جولائی ۲۰۰۶ء)

ساری گولیاں

سمینار میں حصہ لینے کے لئے یورپ کے تقریباً سب ملکوں سے نمائندے آئے ہوئے تھے، جن میں دس بارہ عورتیں بھی شامل تھیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ سب کی آنکھیں دو نوجوان لڑکیوں پر جمی ہوئی تھیں، جو پہلو بہ پہلو بیٹھی تھیں۔ سمینار کے شرکاء کی فہرست میں درج شدہ ناموں سے پتا چلتا تھا کہ وہ ترک تھیں، البتہ جرمنی کے ایک سرکاری سوشل ادارے کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ یوں تو دونوں خوبصورتی میں سب حاضرین کو مات کرتی تھیں، مگر بالخصوص ان میں سے ایک کی طرف دیکھنے سے دل نہیں بھرتا تھا۔ میری طرح سبھی ٹکٹکی باندھے ہوئے اس کو تک رہے تھے۔ مگر اس حسینہ نے پورا دن منہ نہ کھولا اور کسی قسم کے بحث مباحثے میں حصہ نہ لیا۔ اس کے برعکس اس کی ساتھی میلیک (Melek) کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ وہ ہر معاملے میں نپی تلی رائے پیش کرتی تھی اور اکثر اپنی بات منوا لیتی تھی۔

سمینار یورپ کے ممالک کی جانب تیسری دنیا سے ہجرت کر کے آنے والے غیر ملکیوں کے بارے میں تھا، جن کو ہر ملک میں مختلف قسم کے قوانین کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بعض ممالک میں انہیں رہائش اور کام کرنے کی اجازت آسانی سے مل جاتی تھی، جب کہ دوسرے ملکوں میں ان کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیا جاتا تھا، جس کے سبب مہاجر اکثر انڈر گراونڈ چلے جاتے تھے اور چھپ چھپا کر رہتے تھے۔ ان کو اگر کام ملتا بھی تھا، تو چونکہ غیر قانونی ہوتا تھا، اس لئے بہت کم مزدوری ملتی تھی، جس کے خلاف وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کو مزدوروں کی یونین بھی ممبر نہیں بناتی تھی اور نہ ہی کسی یونین نے کبھی ان کے حق میں آواز اٹھائی تھی۔ البتہ کچھ عرصے سے یورپ کے بعض ملکوں کی لبرل پارٹیوں نے اس صورت حال کے خلاف ایک تحریک چلا رکھی تھی۔ یہ سمینار بھی اسی سلسلے میں ہو رہا تھا، جس کا اہتمام جرمن لبرل ڈیموکریٹک پارٹی نے کیا تھا۔

اکثر ڈیلیگیٹ محض تھیوری کی حد تک اس معاملے سے واسطہ رکھتے تھے، جن کا علم اس بارے میں

سرکاری رپورٹوں اور اخباری خبروں تک محدود تھا۔ میں اس سمینار میں شامل دونوں ترک لڑکیوں کے ساتھ تیسرا غیر ملکی تھا۔ اور میرا تعلق بھی ان "ماہرین" سے تھا، جنہوں نے کبھی بھول کر بھی کسی غیر ملکی مزدور سے بات نہ کی تھی، چہ جائیکہ اس کے حالات کے بارے میں کبھی شہر کے گلی کوچوں میں جا کر پوچھ گچھ کی ہو اور اس کے مکان کی حالت زار دیکھی ہو یا اس کے کام کی نوعیت اور اس کے ساتھ ہونے والی دہاندلی کی خبر لی ہو۔ میرے مقابلے میں دونوں ترک لڑکیاں اس موضوع کی سچ مچ ماہر تھیں۔ ان کا واسطہ دن رات غیر ملکیوں اور ان کے ساتھ ہونے والی بے انصافیوں سے پڑتا تھا۔ لگتا تھا کہ ان کو انگریزی نہیں آتی تھی، کیونکہ خاص طور پر ان کی خاطر جرمن ترجمے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ کافی کے وقفے میں وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں، جو جرمن بولتا ہو، سیدھی میرے پاس آ گئیں۔

میں نے میلیک کو اس کے پیش کردہ نکات پر داد دی، جو اس نے اپنے تجربے کی بنا پر پیش کئے تھے اور جن کو عام طور سے سراہا گیا تھا۔ پھر میں نے جاننا چاہا کہ کیا ترکی میں میلیک کا وہی مطلب ہے، جو اردو میں ملکہ کا ہے۔ یہ بات اس کے لئے نئی تھی کہ اردو میں بھی یہ لفظ رائج ہے۔ اس نے کہا ترکی میں ماں باپ بیٹیوں کو یہ نام دیتے ہیں۔

میں نے کہا: "ہمارے ہاں بعض لوگ اپنے بیٹوں کو شہزاد اور بیٹی کو شہزادی کا نام بھی دیتے ہیں، جس کا پوشیدہ مطلب شاید یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتے ہیں۔"

اس نے کہا: میرا باپ بہت سیدھا سادا آدمی تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک بادشاہ کی طرح تھا۔ سارے خاندان کو اس کی ہر بات پر سرخم کرنا پڑتا تھا۔ کیا مجال ہے کہ کبھی بچوں میں سے کسی نے حکم عدولی کی جرات کی ہو۔ اگر کسی نے اس کے سامنے کھڑے ہونے کا جرم کیا، تو وہ میں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اسکول میں استانی بنوں۔ اس لئے میں نے کہا پھر میری شادی کر دو۔ اس طرح مجھے امید تھی کہ اس کے چنگل سے نکلنے کے بعد میں اپنے خاوند سے ملازمت کرنے کی اجازت حاصل کر لوں گی۔"

میں نے پوچھا: "تمہیں کیسے پتا تھا کہ وہ تمہیں اجازت دے دے گا؟"

اس نے کہا: "میں اسے اسکول کے زمانے سے جانتی تھی اور ایک دو بار اس کے ساتھ سینما میں بھی گئی تھی۔ اس لئے مجھے امید تھی کہ وہ میرے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ میں نے شادی سے پہلے ہی اس کو کہہ دیا تھا کہ میرے معاملات میں اسے دخل اندازی کا حق نہیں ہوگا۔ اس نے کہا تم جو چاہے

کرنا۔ میرے لئے اتنا کافی ہے کہ تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو۔"

میں نے پوچھا:" کیا شادی کے بعد اس نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا؟"

اتنے میں کافی کا وقفہ ختم ہو گیا۔

میلیک نے کہا:"اس بارے میں تمہیں پھر کسی وقت بتاؤں گی۔"

دوپہر کے کھانے پر وہ پھر ایک بار میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ اس کی گولیگ سیمرا کی شادی اسی ہفتے ہوئی تھی، اس لئے وہ دوسرا سیشن ختم ہوتے ہی اپنے شہر واپس لوٹ جائے گی۔ یوں بھی اگلے روز سے ویک اینڈ شروع ہو رہا تھا اور اس کا خاوند نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی شادی شدہ زندگی کا پہلا ویک اینڈ اکیلے گزارے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں شام کو جرمنی کے دارالحکومت بون لے جایا جانا تھا، جہاں پر سابق صدر مملکت والٹر شیل شرکاء سیمینار کو خوش آمدید کہنا چاہتے تھے۔ میلیک نے کہا کہ وہ اس سفر کے دوران مجھے میرے سوال کا جواب دے گی، جو میں نے کافی کے وقفے میں کیا تھا۔

بس میں سفر کے دوران میلیک میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر ایک بار ہماری گفتگو دوپہر والے موضوع کی طرف چلی گئی۔

اس نے کہا:" صبح کافی کے وقفے میں تم یہ جاننا چاہتے تھے کہ میرے خاوند کا سلوک میرے ساتھ کیسا تھا؟"

میں نے کہا:"اگر تم اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی ہو، تو ہم کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کر سکتے ہیں۔"

اس نے کہا:" مجھے اس بارے میں بات کرنے پر شرم نہیں آتی۔ اس کا سلوک میرے ساتھ نہایت رذیل تھا، جس کی ابتداء ہماری منگنی کے زمانے میں ہی ہو گئی تھی۔ جب ہماری طرف سے اس کے خاندان کے سامنے میرے رشتے کی تجویز رکھی گئی، تو وہ اس بات پر بہت خوش ہوئے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میرے باپ جیسا معزز آدمی، جو شہر بھر میں جانا پہچانا تھا، اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ چونکہ اس زمانے میں میرے منگیتر کی آمدنی بہت محدود تھی، اس لئے میرے باپ نے کہا کہ وہ ہمارے مکان کا کرایہ ادا کر دیا کرے گا۔ اس پر میرے ہونے والے خسر نے کہا کہ وہ ہمیں کھانے پینے کا سامان خرید دیا کرے گا۔ بلکہ دونوں باپوں نے اس کے علاوہ بھی ہمیں ماہوار رقم دینے کا وعدہ کیا۔ مگر پھر میں نے سنا کہ میرا منگیتر کسی دوسری لڑکی سے شادی کا وعدہ کر چکا تھا،

اس لئے میں نے اس کے ساتھ اپنی منگنی توڑنے کا ارادہ باندھ لیا۔ یہ بات میں نے اپنی ماں سے کہہ دی، بلکہ خود اپنے منگیتر تک پہنچادی۔"

میں نے پوچھا:" تمہارے منگیتر نے اس پر کیا کہا؟"

اس نے جواب دیا:"وہ ایک روز موقع پا کر ہمارے گھر آیا، جب وہاں پر میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگادی اور میرے ساتھ زبردستی جماع کیا۔ اس نے میری ایک نہ سنی اور مجھ پر رحم نہ کھایا۔ بلکہ درندوں کی طرح مجھ پر پل پڑا۔ اس کے بعد اس نے کہا: اب میں دیکھوں گا کہ تم منگنی کیسے توڑتی ہو۔"

میں نے پوچھا:" تمہاری فیملی کا ردعمل کیا تھا؟"

اس نے کہا:"میں شرم کی ماری کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ میرے باپ کو پتا چل جاتا: تو وہ اس کو گولی سے مار ڈالتا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہمارے خاندان کے اچھے نام پر دھبہ لگے۔ اس لئے میں چپ ہو رہی۔ اور تمہیں یقین نہیں آئے گا، مگر یہ سچ ہے کہ اس ایک بار کے جماع سے مجھے حمل ٹھیر گیا تھا۔ میری بڑی بیٹی اسی زنا بالجبر کا پھل ہے۔"

میں نے کہا: "تو کیا تمہاری شادی اسی لڑکے سے ہوئی ؟"

اس نے کہا:"ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر میں نے اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہوتا اور چند ہفتوں میں سب کو میرے حمل کا پتا چل جاتا، تو میرے ماں باپ کے نام پر حرف آتا۔ تم تصور کر سکتے ہو کہ میں جلد از جلد اس شخص سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ مگر دوسری طرف میرے شادی شدہ ہونے کا یہ فائدہ تھا کہ میں ملازمت اختیار کر سکتی تھی۔ اب میرا باپ مجھے اس سے نہیں روک سکتا تھا۔ مگر ہمارے شہر میں کوئی اسامی خالی نہیں تھی۔ مجھے محکمہ تعلیم کے ایک کارکن نے کہا کہ اگر تم کسی دوسرے چھوٹے شہر میں چلی جاؤ، تو عین ممکن ہے کہ تمہیں وہاں پر رکھ لیا جائے گا۔ میں چونکہ اکیلی نہ جا سکتی تھی، اس لئے مجھے پہلے اپنے شوہر کی تبدیلی وہاں پر کرانی تھی۔ یہ کام میرے ماموں کے ذریعہ ممکن بن سکا، جو ہمارے صوبے میں اونچی پوسٹ پر تھا۔"

میں نے پوچھا:" کیا تمہیں ملازمت حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی تھی؟"

اس نے کہا:"نہ صرف یہ کہ مجھے ایک اسکول میں رکھ لیا گیا، بلکہ میری ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے زمانے کی ایک استانی کا پیغام ملا کہ کیا میں اس کے اخبار میں ایک مستقل کالم لکھنا چاہوں گی۔ یہ

اخبار اس کو اپنے مرحوم خاوند کے ورثے میں ملا تھا۔ چنانچہ میں نے وہاں پر ایک ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کر دیا۔ مگر یہ چیز میرے خاوند کو بالکل نہ بھاتی تھی، کیونکہ میرا تعلق سوشلسٹ گروپ سے تھا، جس کو عام طور سے ترکی میں پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ میرے شوہر نے کہا کہ وہ اپنے کولیگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا، کیونکہ اس کی بیوی اخبار میں ایسی باتیں لکھتی ہے، جو اتاترک کی تعلیمات کے خلاف ہیں۔"

میں نے کہا: "گویا تم نے اپنے لئے خود مشکلات پیدا کر لی تھیں۔"

اس نے کہا: "صرف یہی نہیں۔ میں نے ٹیچرز یونین کو جائن کر لیا تھا، بلکہ اس کی عہدے دار بن گئی تھی۔ اس جرم کی بنا پر مجھے اسکول کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ پھر اخبار کی مدیرہ نے مجھے بتایا کہ اس کو گورنر کا فون آیا تھا، جس نے مطالبہ کیا تھا کہ تمہارے کالم کا چھپنا فوری طور پر روک دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا' تو حکومت اخبار کا ڈیکلیریشن ضبط کر لے گی۔ اس وجہ سے میں آئندہ تمہارا کالم نہیں چھاپ سکتی۔ گویا بیک وقت ملازمت کے ساتھ ساتھ میری صحافتی زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔"

اس عرصے میں ہماری بس بون پہنچ گئی تھی اور ایک پارکنگ لاٹ میں داخل ہو رہی تھی، جو بہت وسیع و عریض تھی۔ جب ہم بس سے اترے، تو میں نے دیکھا کہ میلیک کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہولے سے میرے کان میں کہا: "جب بھی مجھے بس میں سفر کرنا پڑتا ہے، میرا بلڈ پریشر گڑبڑا جاتا ہے اور مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ تم یوں کرو کہ میرے کندھے پر اپنا بازو رکھ کر مجھے سنبھالو تاکہ میں کہیں گر نہ جاؤں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے سے لپٹے لپٹائے ہوئے ہوٹل تک پہنچے۔"

کھانے کی میز پر میری سیٹ لارڈ ایوبری کے پہلو میں تھی۔ انہوں نے سرگوشی میں کہا: "تم تو چھپے رستم نکلے۔ آتے ہی سیمینار کی ملکہء حسن پر ڈورے ڈال دیئے ہیں۔"

لارڈ ایوبری انگلستان سے آنے والے وفد کے سربراہ تھا۔ ہماری بے تکلفی اس زمانے سے تھی، جب برٹش لیبر پارٹی نے مجھے لندن آنے کی دعوت دی تھی اور ایک شام لارڈ ایوبری نے اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد اپنے محل نما مکان سے نقل مکانی کر کے پہلے وقتوں کے اصطبل میں مقیم تھے، جس کو رد و بدل کرنے کے بعد ایک لارڈ کے لئے قابل رہائش بنایا جا چکا تھا۔ اگر وہ اس بارے میں خود نہ بتاتے، تو شاید میں اس امر کو نہ جان پاتا کہ بیسویں صدی کی ابتداء تک وہاں پر گھوڑے گاڑیاں رکھی جاتی تھیں اور اوپر کی منزل پر گھوڑوں کے سائیس رہا کرتے تھے۔ وہ شام ان کی اور ان کی گرل فرینڈ کی معیت میں خوب گزری تھی۔

مگر بون میں سابق جرمن صدر مملکت والٹر شیل کے ساتھ ہماری شام بے حد بور تھی۔ موصوف کسی قسم کی سنجیدہ گفتگو کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ گھنٹوں تک ادھر ادھر کے لطیفے سناتے رہے۔ دراصل ان کی دلچسپی کا مرکز ایک چنیدہ شراب تھی، جو اس ہوٹل میں ہمیں پینے کے لئے پیش کی گئی تھی اور وہ بھی شاید یہ تہیہ کئے بیٹھے تھے کہ جب تک ہوٹل کا سارا ذخیرہ ختم نہ ہو جائے، وہ محفل کو اٹھنے نہیں دیں گے۔ اس وجہ سے بون سے ہماری واپسی کہیں آدھی رات کے بعد جا کر ممکن ہو سکی۔

بس میں میلیک پھر میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی زندگی کی کہانی سننے کا شوق تھا۔ مگر وہ باتیں کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔ دراصل اس کا بلڈ پریشر اس کو تنگ کر رہا تھا۔ اس کو ہر روز دوائی کھانی ہوتی تھی، جس میں اس روز کسی وجہ سے ناغہ ہو گیا تھا۔

اس نے کہا: "سنانے کو ابھی بہت کچھ باقی ہے، مگر اس وقت مجھ میں باتیں کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ صبح ناشتے کی میز پر ہم اپنی گفتگو کو جاری رکھیں گے۔"

چنانچہ اگلے روز میں نے ناشتے کے ہال میں ایک الگ تھلگ میز چنی اور میلیک کا انتظار کرنے لگا، جو کسی قدر دیر سے نمودار ہوئی۔ اس نے بے حد دلکش ہلکا ہلکا میک اپ کر رکھا تھا اور پہلے دن سے بڑھ کر خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں نے پھر ایک بار احتیاطاً کہا کہ اسے اپنی زندگی کی کہانی سناتے ہوئے کسی قسم کی رازدارانہ باتیں نہیں بتانی چاہئیں، جن کو یاد کر کے اسے بعد میں افسوس ہو سکتا ہے۔

اس نے کہا: "میں نہ صرف تمہیں بلکہ ساری دنیا کو اپنی زندگی کی کہانی سنانی چاہتی ہوں۔ اب وہ شخص تو رہا نہیں، جس کی خاطر میں شاید خاموشی اختیار کرتی۔ جانتے ہو کہ میرا باپ اسی لئے وقت سے پہلے مر گیا تھا کہ اس کی بیٹی نے اپنے خاوند سے طلاق لینے کا عزم کر لیا تھا۔ دراصل میرے خاوند نے ایک آوارہ عورت کے ساتھ یاری گانٹھ لی تھی اور بعض اوقات دو تین روز تک گھر نہیں آتا تھا۔ جب میں نے اس بارے میں اس کے ساتھ بات کرنا چاہی، تو اس نے کہا تم بھی کسی مرد کے ساتھ یاری لگا لو۔ اس پر میں نے طلاق لینے کا ارادہ کیا اور ایک وکیل کے پاس گئی، جس نے میرے باپ کا نام سنتے ہی کہا کہ وہ میرے باپ کو جانتا ہے اور اس کیس کی پیروی نہیں کرنی چاہتا۔ میں اس کے آفس سے نکل کر ایک دوسرے وکیل کے پاس پہنچی، جس نے میرے کیس کی تفصیلات نوٹ کرنے کے بعد میرے باپ کا نام پوچھا اور کہا کہ وہ بعد میں مجھ سے رابطہ کرے گا۔ میں وہاں سے اٹھ کر شہر میں خریداری کے لئے چلی گئی۔ شام کے وقت میں گھر لوٹی، تو میرا باپ ہمارے گھر کے دروازے پر کھڑا میری راہ تک رہا تھا۔ وکیل نے

اس کوفون کر کے ساری کیفیت بیان کر دی تھی، جس کو سنتے ہی میرا باپ فوراً ٹیکسی لے کر ستر کلومیٹر دور اس شہر میں پہنچا تھا، جہاں پر ہم رہتے تھے۔ اس نے کہا کیا تم طلاق لے کر میری موت کا سامان کر رہی ہو۔ ساتھ ہی اس نے زندگی میں پہلی بار مجھے تھپڑ مارا۔ میں نے اس کے بعد طلاق کا نام تک نہ لیا۔ مگر میرا باپ اس واقع کے چھ ماہ بعد اچانک مر گیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کا دل توڑا تھا اور اس کی موت کا سبب بنی تھی۔"

میں نے کہا: "اس کی موت کا وقت آیا ہوا تھا۔ تمہاری طلاق لینے کی خواہش نے اس کا دل دکھایا تھا، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ بات پیش نہ آتی، تو وہ لمبے عرصے تک زندہ رہتا۔"

اس نے کہا: "باپ کے اس طرح اچانک مرنے کے بعد میں نے ترکی سے ہجرت کر جانے کا ارادہ باندھ لیا۔ اس زمانے میں جرمنی کی طرف سے ترک مزدوروں کو بھرتی کرنے کی سکیم چل رہی تھی، جس کے تحت ہزاروں مرد اور عورتیں جرمن کارخانوں میں کام کرنے کے لئے بھرتی کی جا رہی تھیں۔ میں نے اس بات کا ذکر اپنی ماں سے کیا، کیونکہ میں چاہتی تھی کہ وہ میری بیٹی کو جو اس وقت تین برس کی تھی اپنے پاس رکھ لے۔ اس نے کہا صرف اس شرط پر کہ تم مجھے اپنی جرمن آمدنی سے ایک مکان بنا کر دینے کا وعدہ کرو۔ جب میں نے اپنے خاوند سے اپنے ارادوں کا ذکر کیا، تو وہ میری منتیں کرنے لگا کہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ اور اگر جانا ہی ہے، تو وہاں پر کسی دوسرے مرد سے یاری نہ گانٹھ لینا۔"

میں نے پوچھا: "کیا تمہارا خاوند تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا تھا؟"

اس نے کہا: "میں اسی سے تو بھاگ رہی تھی۔ اس کو اپنے ساتھ لے جانے کی بھلا کیا تک تھی۔ جب میں نے ترکی کے ایمپلائمنٹ آفس سے اس بارے میں معلومات حاصل کیں، تو پتا چلا کہ جرمن حکومت صرف ایسی عورتیں قبول کرنے کے لئے تیار ہے، جو پوری طرح صحتمند ہوں اور بس معمولی سا لکھنا پڑھنا جانتی ہوں۔ اتنا کافی ہے کہ وہ اپنا نام لکھ سکتی ہوں۔ اس لئے اگر میں درخواست دینا چاہتی ہوں، تو کسی کو نہ بتاؤں کہ میں نے ٹیچرز ٹریننگ کورس کر رکھا ہے اور اخبار میں ہفتہ وار کالم لکھتی رہی ہوں، کیونکہ یہ چیز میرے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔"

میں نے کہا: "آج کل جرمنی میں یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ ترک مزدور دوزبانوں میں ان پڑھ ہیں۔ ان کو نہ ترکی آتی ہے اور نہ جرمن۔"

اس نے کہا: "جب میں استنبول کے جرمن لیبر آفس میں پہنچی، جو خاص طور پر ترک مزدوروں کو

بھرتی کرنے کے لئے کھولا گیا تھا، تو وہاں پر مجھ سے سب سے پہلا سوال یہ پوچھا گیا تھا کہ میں نے پڑھنا لکھنا کہاں اور کیسے سیکھا تھا۔ کہیں میں اسکول میں تو نہیں گئی تھی۔ چونکہ مجھے خبردار کیا جا چکا تھا، اس لئے میں نے کہا: میں بس اپنا نام لکھ سکتی ہوں۔"

میں نے پوچھا:" کیا اس کے سوا وہ لوگ کچھ نہیں جاننا چاہتے تھے؟"

اس نے کہا:" یہ تو محض ابتداء تھی۔ اصل مرحلہ ڈاکٹری معائنے کا تھا۔ ہر کسی کا ایکس رے لیا گیا اور جرمن ڈاکٹروں نے، جن میں ایک بھی لیڈی ڈاکٹر شامل نہ تھی، ہماری چھاتیوں کو اپنے ہاتھوں سے خوب لتاڑا اور ٹٹولا۔ پھر دس دس عورتوں کے گروپ کو سارے کپڑے اتار کر الف ننگا کر کے اوپر سے نیچے تک کے تمام سوراخوں میں انگلیاں اور آلے ڈال ڈال کر دیکھا اور اطمینان کیا کہ ہم بیماریوں سے پاک ہیں۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے جرمن مردوں کے لئے ترک عورتیں چنی جا رہی تھیں۔ جب کہ دراصل ہمیں وہاں پر صرف فیکٹریوں میں مزدوری کرنی تھی۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے کسی عورت نے اس روز تک کوئی فیکٹری نہیں دیکھی تھی۔ ہمیں پتا نہیں تھا کہ فیکٹری کیا ہوتی ہے اور ہمیں وہاں پر کیسا کام کرنا ہوگا۔"

میں نے پوچھا:" جرمنی میں تمہارے رہنے سہنے کا کیا انتظام تھا؟"

اس نے کہا:" ہمیں فیکٹری کی بیرکوں میں ٹھیرایا گیا تھا، جس کے ایک ایک کمرے میں دو دو تین تین عورتیں ٹھونس دی گئی تھیں۔ کچن اور باتھ روم سب کا سانجھا تھا، جن کی صفائی ستھرائی کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ کسی نے کبھی ایک منٹ کے لئے بھی ہمیں جرمن زبان نہیں سکھائی۔ میں کسی لینگویج اسکول میں نہیں گئی نہ ہی مجھے پتا تھا کہ ایسے اسکول پائے جاتے ہیں۔ ہماری زندگی بیرک اور فیکٹری کے درمیان بسر ہوتی تھی۔ کسی نے ہمیں شہر آنے جانے کا راستہ نہیں دکھایا اور نہ ہی بتایا کہ بس میں سفر کرنے کے لئے ماہوار ٹکٹ سستے داموں پر مل سکتے ہیں۔ یہ اور دوسری ساری باتیں ہم نے خود دریافت کیں۔"

میں نے پوچھا:" کیا فیکٹری کی طرف سے تم لوگوں کی دیکھ بھال کے لئے کسی کو مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں ایک بار ہمبرگ میں ترک مزدوروں کی بیرکوں کو دیکھنے کے لئے گیا تھا، تو وہاں پر میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی تھی، جو خود ترک تھا اور جسکو وہاں پر اوورسیر مقرر کیا گیا تھا۔"

اس نے کہا:" ہمبرگ میں ایسا ہوگا۔ ہنوور کی اس فیکٹری کی بیرکوں کا کوئی اوورسیر نہیں تھا، جہاں پر میں نے جرمنی میں قیام کا ابتدائی زمانہ گزارا تھا۔"

میں نے پوچھا:" تم کتنے عرصے تک جرمنی میں قیام کرنے کے بعد پہلی بار ترکی گئی تھیں؟"

اس نے کہا:" پہلی بار میں ایک سال کے بعد گئی تھی، کیونکہ میں اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہاں پر ایک طرف میری ماں کو اپنے لئے مکان بنانے کی جلدی تھی، جس کے لئے میری جمع شدہ پونجی ابھی کافی نہ تھی۔ دوسری طرف میرا خاوند میرے پیچھے پڑ گیا کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اس دوران میں جرمنی میں ایک قانون پاس ہو گیا تھا، جس کے تحت جرمنی میں کام کرنے والے گیسٹ ورکرز اپنے فیملی ممبروں کو بلا سکتے تھے۔ اس نے کہا میں تمہاری ہر بات مانوں گا اور جو کچھ تم کہو گی، وہی کروں گا۔ میں اس کی باتوں میں آ گئی اور میں نے اس کے لئے درخواست دینے کا وعدہ کر لیا۔ دراصل جرمنی میں اکیلی رہتے رہتے میرا دل بھر چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ جرمنی میں، جہاں کی زبان وہ نہیں جانتا اور نہ ہی وہاں کے طور اطوار سے اس کی شناسائی ہے، وہاں پر میں اسے اپنی جوتی تلے رکھ سکوں گی۔ مگر بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ میں خود فریبی کا شکار تھی۔"

میں نے پوچھا:" کیا اس کے جرمنی آنے سے پہلے تمہیں رہائش کے لئے فلیٹ مل گیا تھا؟"

اس نے کہا:" دو سالہ قیام کے بعد کہیں جا کر مجھے ایک دو کمروں کا فلیٹ حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی تھی۔ میرے خاوند کو جرمنی آنے کے لئے اجازت حاصل کرنے میں پورا سال لگ گیا تھا۔ میری بیٹی اس دوران میں پانچ برس کی ہو چکی تھی اور میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ دونوں باپ بیٹی اکٹھے جرمنی آئے تھے۔ اور پہلے دو برسوں تک ہمارے تعلقات ٹھیک ٹھاک رہے۔ بلکہ اس عرصے میں ہمارے ہاں دوسری بیٹی بھی پیدا ہوئی۔ پھر ہمارے درمیان ناچاقی پیدا ہو گئی، جس کا سبب میرے خاوند کی شراب نوشی بنی۔ یہی بری عادت اس کے کار کے حادثے میں مرنے کا باعث بنی۔ البتہ مجھے بیوگی کی پنشن مل گئی تھی اور میری دونوں بیٹیوں کا یتیمی کا وظیفہ لگ گیا تھا۔"

میں نے کہا:" پھر تم تو اچھی خاصی خود کفیل اسامی ہو۔ کیا تم پھر سے شادی شدہ ہو؟"

اس نے کہا:" نہیں۔ یہ بے وقوفی مجھ سے دوسری بار سرزد نہیں ہو گی۔ یوں بھی شادی کرنے پر بیوگی کی پنشن بند ہو جاتی ہے۔ میں اس بات پر خوش ہوں کہ مجھے کسی کی محتاجی نہیں اٹھانی پڑی۔ میری بڑی بیٹی اسکول پاس کرنے کے بعد اب پریکٹیکل ٹریننگ لے رہی ہے۔ جب کہ دوسری بیٹی، جو عین مین مجھ پر گئی ہے، جمنازیم میں پڑھتی ہے۔ اس کا ارادہ یونیورسٹی جائن کرنے کا ہے۔ "

سیمینار کے خاتمے پر میلیک نے مجھے ہمبرگ واپس جاتے ہوئے اپنے شہر میں اترنے کی دعوت

دی، جو راستے میں پڑتا تھا۔ مگر میں اس کی دعوت کو اس لئے قبول نہ کر سکتا تھا کہ مجھے وہاں سے شٹوٹگارٹ جانا تھا، جہاں پر اس سے اگلے روز ایک کانفرنس میں میری تقریر رکھی گئی تھی۔ البتہ میں نے وعدہ کیا کہ جب کبھی میرا گزر اس کے شہر سے ہوگا میں اطلاع دے کر اس کو اور اس کی بیٹیوں سے ملنے کے لئے آؤں گا۔

اس ملاقات کا موقع کچھ عرصے کے بعد نکل آیا۔ میں اس کے شہر میں شام کو پہنچا جب میلیک اپنی جاب سے اور اس کی بیٹیاں اپنے تعلیمی اداروں سے چھٹی کر کے گھر لوٹ چکی تھیں۔ لڑکیاں ماں پر گئی تھیں اور خوبصورتی میں اس سے ہٹی نہ تھیں۔ ان کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کی رائے اپنے باپ کے بارے میں وہی تھی، جس کا اظہار میلیک میرے سامنے کر چکی تھی۔ بلکہ انہوں نے اس بات پر قدرے اطمینان کا اظہار کیا کہ ان کا باپ وہاں پر پہنچ چکا تھا، جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ بڑی بیٹی لیلیٰ نے کہا کہ اگر وہ کسی روز واپس آ نکلے، تو وہ یقیناً گھر سے بھاگ جائے گی۔ چھوٹی بیٹی حلیا نے کہا کہ وہ اس کو جانتی ہی نہیں۔ میلیک ہی اس کی ماں ہے اور باپ بھی۔

ہمارے پاس باتیں کرنے کے لئے پوری رات پڑی تھی اور میلیک یوں بھی باتوں کی پوٹلی تھی۔ وہ مجھے صبح پو پھٹنے تک اپنے شب و روز کے مسائل کے بارے میں بتاتی رہی، جن کا تعلق اس کے سوشل ڈپارٹمنٹ میں کام سے اور اس سے بڑھ کر اس چیز سے تھا کہ لیلیٰ گھر بار کو خیر باد کہہ کر ایک ترک دوست کے ساتھ مل کر اپارٹمنٹ لینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے کہا کہ اس کے نتیجے میں ترک کالونی میں اس کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہے گی۔ اسے پتا تھا کہ ترکوں میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی، اس لئے لڑکے کے ماں باپ کسی صورت میں بھی اپنے بیٹے کا رشتہ اس کی بیٹی سے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ مگر لیلیٰ کو اس بات کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ بھی جرمن نوجوانوں کی طرح ہر قسم کے پھندوں کو توڑنے کی ٹھانے ہوئی تھی۔ آخر وہ میلیک کی بیٹی تھی، جو اپنی جوانی میں اس سے کم پگلی نہ تھی۔

جب مجھے اگلی بار ایک ایسی کانفرنس میں شرکت کی دعوت لوزان (سوئٹزرلینڈ) سے ملی، تو میں نے میلیک کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا، جس کے لئے وہ فوراً تیار ہوگئی۔ ہم نے یہ سفر رات کی گاڑی سے سلیپنگ کار میں کیا، جو اگلی صبح سرحدی مقام بازل پہنچتی تھی۔ ہمیں وہاں سے گاڑی بدلنی تھی، جو تیار کھڑی تھی۔ مگر اس میں ڈائننگ کار سرے سے موجود نہ تھی۔ گویا ہمیں لوزان پہنچنے تک کھانے پینے کو کچھ نہیں مل سکے گا۔ مجھے اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ناشتہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے ملے یا بالکل نہ ملے۔ مگر اس

عرصے میں میلیک کو بھوک کے مارے دوران سر کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اور باوجود اس امر کے کہ میں ریلوے اسٹیشن سے ناشتے کا سامان مہیا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اس کی جان اس اذیت ناک مرض سے آئندہ دو روز تک نہ چھوٹ سکی۔ لوزان میں کم وبیش دو فٹ برف گر چکی تھی اور شہر کا ٹریفک جام تھا۔ کانفرنس کے دوران میلیک بحث مباحثے میں شرکت نہ کر سکی، کیونکہ سر درد کے سبب اس کی سوچنے اور بولنے کی صلاحیت مکمل طور پر سلب ہو چکی تھی۔ جس کا مجھے اس سے بڑھ کر افسوس تھا۔

چند ماہ بعد میلیک نے مجھے اپنے خط میں لکھا کہ لیلیٰ حمل سے ہے اور اس کا دوست اپنا بوریا بستر سمیٹ کر جا چکا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے سامنے ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کی تجویز نہیں رکھ سکتا، جو باکرہ نہ ہو۔ میلیک نے لکھا اس کا دل چاہتا ہے کہ کہیں سے ایک پستول حاصل کرے اور جا کے ساری گولیاں اس کے سینے پر داغ دے۔

(کمر فیلڈ۔ ۱۴ اگست ۲۰۰۶ء)

اوورکوٹ

اس زمانے میں میرا روز کا معمول تھا کہ صبح کام پر جاتے ہوئے کار کو یونیورسٹی کے گیراج میں پارک کرنے کے بعد انسٹی ٹیوٹ تک، جو وہاں سے پندرہ منٹوں کے فاصلے پر تھی، پیدل جاتا تھا اور اس بات پر خوش ہوتا تھا کہ اس طرح سویرے سویرے تھوڑی سی ورزش بھی ہو جاتی ہے۔ راستے میں دمتوڑ اسٹیشن پڑتا تھا، جہاں پر مضافات سے آنے والی گاڑیاں ہر دو تین منٹوں کے بعد آ کر رکتی تھیں اور ان میں سے انسانوں کا ایک ریلا نکل کر یونیورسٹی کی جانب چل دیتا تھا، جس طرف سے میں آ رہا ہوتا تھا۔ اس طرح میرا واسطہ سامنے سے آنے والے انسانی ہجوم سے بار بار پڑتا تھا۔ انسانوں کا یہ ریلا پانی کے سیلاب کی طرح تھا، جس سے بچنے کے لئے مجھے کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف راستے سے ہٹ جانا پڑتا تھا، وگرنہ خطرہ تھا کہ وہ سونامی کی طرح مجھے روندتا ہوا سر کے اوپر سے گزر جائے گا۔

لمبے عرصے سے یورپ میں قیام کے سبب میں بھی دوسروں کی طرح لوگوں کو نظر انداز کرنے میں مہارت پیدا کر چکا تھا۔ اس لئے اکثر مجھے خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ کون میرے پاس سے گزر گیا تھا اور کون نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آہستہ آہستہ بیشتر لوگوں کے چہرے مجھے جانے پہچانے لگنے لگے تھے۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ اگر کوئی ان میں سے کسی روز نظر نہ آتا تھا، تو مجھے اس کی غیر حاضری کا احساس ہو جاتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ فلاں چہرہ آج دکھائی نہیں دیا۔ اس چیز میں البتہ ایک استثناء پایا جاتا تھا۔ مجھے ایک بیس بائیس برس کی طرحدار لڑکی کا ہر روز انتظار رہنے لگا تھا، جو ایک معین جگہ پر سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ وہ شاذ و نادر ہی کبھی ناغہ کرتی تھی اور کپڑے بہت چنیدہ پہنتی تھی۔ اس کے کندھے سے لٹکتے ہوئے بیگ سے، جو کتابوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا، پتا چلتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کی طالبہ علم تھی۔ مگر دوسری لڑکیوں کے برعکس، جو عام طور سے لجاتی ہوئی چلتی تھیں اور جن کا ایک ایک قدم فیشن پریڈ کی طرح اٹھتا تھا، وہ کسی فوجی کی طرح لفٹ رائٹ کرتی ہوئی جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں فٹ پاتھ پر گڑی ہوتی تھی۔ کیا

مجال ہے جو اس نے کبھی دائیں یا بائیں دیکھا ہو۔ میں نے دل ہی دل میں اسکا نام "فلنٹن وائب" (بندوق بردار عورت) رکھ چھوڑا تھا، جو جرمنی میں ان عورتوں کے لئے گھڑا گیا تھا، جو دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں شہروں سے مردوں کی عدم موجودگی کے سبب، جو سارے کے سارے جنگ کے محاذ پر بھیج دیئے گئے تھے، بندوقیں کندھوں پر اٹھائے ہوئے شہروں میں پہرہ دیا کرتی تھیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بندوق کے استعمال سے بھی نہ چوکتی تھیں۔ وہ مردوں سے بڑھ کر نازی پارٹی کی فرماں بردار تھیں۔

دھیرے دھیرے مجھے ہر روز اس کا انتظار رہنے لگا۔ میں دل ہی دل میں قیاس آرائیاں کیا کرتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے کس شعبے میں پڑھتی ہوگی۔ اب میں یہ تو نہیں کر سکتا تھا کہ اسے راستے میں روک کر پوچھوں کہ وہ کیا پڑھتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات پر بگڑ جائے اور کہے کہ جناب کو یہ بات پوچھنے کا حق کس نے دیا ہے؟ اس لئے میں نے دل میں سوچا وہ کچھ بھی پڑھتی ہو، مجھے اس بات سے کیا لینا دینا ہے۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ سویرے سویرے اس کا دیدار مجھے سارا دن مسرور رکھتا ہے اور میں اگلی صبح کی راہ تکنے لگتا ہوں۔

آہستہ آہستہ وہ مجھے اتنی جانی پہچانی لگنے لگی کہ میں نے اسے "صبح بخیر" کہہ کر سلام کرنا شروع کر دیا۔ ایک دو روز تک اس بات پر شاید حیران ہونے کے بعد وہ میرے سلام کا جواب اپنی بے حد موہنی مسکراہٹ کے ساتھ دینے لگی، بلکہ آئندہ دنوں میں اکثر پہل کرنے لگی۔ جرمنی میں گاؤں کے باسی اب بھی ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، مگر شہروں میں اس کا رواج عرصہ ہوا نہیں رہا۔ بہرصورت یہ ہمارا روز کا معمول بن گیا اور مہینوں تک اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

پھر ایک روز اچانک عین اس وقت بارش کے بوندیں گرنے لگیں، جب ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ میں نے جرمنوں کی طرح ترت اپنے بیگ میں سے چھتری نکال کر سر پر تان لی، مگر میں نے دیکھا کہ وہ چھتری کے بغیر تھی اور بارش میں بھیگ رہی تھی۔ میں نے "صبح بخیر" کہنے سے بھی پہلے اسے اپنی چھتری کے نیچے آ جانے کو کہا اور رخ موڑ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے کہا اگر وہ پسند کرے، تو میں اسے اس کی منزل مقصود تک چھتری کے سائے میں پہنچانے کے لئے تیار ہوں۔ اس نے کہا آپ کے وقت کا حرج ہوگا۔ میں اگر تھوڑی بہت بھیگ بھی گئی، تو کوئی بات نہیں، میں نمک کی ڈلی تو ہوں نہیں کہ گھل جاؤں گی۔ میں نے کہا مگر گیلے کپڑوں میں کسی لیکچر روم میں جا کر بیٹھنے سے بہتر ہے کہ

آپ میری پیش کش کو منظور کرلیں، جو بالکل مفت ہے۔اس پر آپ کا ایک دھیلا بھی نہیں لگے گا اور میں سارا دن مسرور رہوں گا کہ آپ کے کسی کام آ سکا تھا۔راستے میں اس نے بتایا کہ وہ قانون پڑھتی ہے اور ابھی دوسرے سمسٹر میں ہے۔ میں نے کہا پھر تو ہمارا صبح کا ملاپ بہت دنوں تک چلے گا۔ بشرطیکہ آپ یونیورسٹی بدل کر کسی دوسرے شہر نہ چلی جائیں۔

اس نے کہا:" آپ کو اتنے مہینوں سے ہر صبح عین وقت پر دیکھتے دیکھتے میں اس چیز کی اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ اس راستے کا آپ کے بغیر تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

میں نے جواب دیا:" میں وقت کی پابندی صرف آپ کو" صبح بخیر" کہنے کے لئے کرتا ہوں اور آپ جانتی ہیں کہ میرے سوا اس بھری پری سڑک پر کوئی شخص اس طرح کی دقیانوسی روایت کا پاس نہیں کرتا۔ "

اس نے بتایا کہ ابتداء میں اسے اس بات پر حیرت ہوئی تھی اور وہ دو تین روز تک سمجھتی رہی تھی کہ میرا سلام شاید کسی دوسرے شخص کے لئے تھا۔مگر پھر اس نے دیکھا کہ سلام کرتے وقت میری نظریں اس کے چہرے پر مرتکز ہوتی تھیں۔اس لئے اس نے سلام کا جواب دینا شروع کر دیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کو یہ رسم اچھی لگنے لگی تھی۔ہم اس دوران میں یونیورسٹی کے شعبہ قانون کی مرکزی عمارت کے سامنے پہنچ چکے تھے۔اس نے رخصت کے وقت گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اگلے روز ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت ہوگئی۔

اس کے بعد مہینوں تک ہمارا وہی سابقہ معمول رہا۔البتہ اب یہ فرق پڑ گیا تھا کہ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑتی تھی،اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی اور اس کی" صبح بخیر" میں اب شہد کی شیرینی گھلی ہوئی ہوتی تھی۔مگر اب بھی ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہ ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک روز اس نے مجھے رک جانے کا اشارہ کیا اور بتایا کہ اس روز اس کی سالگرہ ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ ایک قریبی چائنا ریستوراں میں کھاؤں۔

کھانے سے پہلے ہم نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔اس کا نام زیگلنڈے تھا، جو قدیم جرمن میتھولوجی سے چنا ہوا لگتا تھا۔اس نے کہا کہ وہ بھی میری طرح اس شہر میں غیر ملکی ہے، کیونکہ اس کا خاندان دوسری جنگ عظیم کے بعد شلیز یا سے نکالے جانے کے بعد وہاں پر آ کر آباد ہوا تھا۔اس کا تعلق ایک ارسٹوکریٹک فیملی سے تھا،جس کی وہاں پر لمبی چوڑی جاگیر تھی۔مگر یہ سب کچھ اب ماضی کا حصہ بن

چکا تھا۔اس کا باپ فوج کا ریٹائرڈ کرنل تھا، جس کو جنگ کے بعد امریکی قید کاٹنی پڑی تھی۔ جب وہ وہاں سے لوٹا، تو بالکل چھڑا چھانٹ تھا۔ اس وقت اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔اس کی بیوی اور بچے جنگ کے دوران بمباری کا شکار ہو گئے تھے۔ دوسری شادی کے لئے اس نے اپنے علاقے کی ایک لڑکی کو چنا، جو اس کی طرح اپنے خاندان میں سے اکیلی بچ نکلی تھی۔ دونوں کی عمروں میں تیس برس کا فرق تھا۔ گویا میاں بیوی کے درمیان ایک پوری نسل کا فاصلہ پایا جاتا تھا اور باپ اور بیٹی کے درمیان ایک چھوڑ دو نسلیں حائل تھیں۔اس لئے جب وہ کنڈرگارٹن میں تھی، تو نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے چھٹی ہونے پر لینے کے لئے آئے، کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ دوسرے بچے سمجھیں گے کہ اس کا دادا ماں باپ کی بجائے اسے لینے کے لئے آتا ہے۔

میں نے کہا:" تمہارے تعلقات باپ کے ساتھ کیسے ہیں؟"

اس نے کہا:" ویسے، جیسے ان لوگوں کے ہوا کرتے ہیں، جن کی عمروں میں نصف صدی کا فرق پایا جاتا ہے۔ وہ اس زمانے میں پیدا ہوا تھا، جب جرمنی میں بادشاہت قائم تھی اور ملک میں سپاہیانہ روایات کو اہمیت دی جاتی تھی۔احکام اوپر سے جاری ہوتے تھے اور ہر کسی کو سرخم کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے وقتوں میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔آج بچے بھی اپنے حقوق مانگتے ہیں۔ وہ زمانہ لد گیا ہے، جب ماں باپ اپنی اولاد کی قسمت کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔اس بات سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میرے تعلقات باپ کے ساتھ بہت کشیدہ ہیں۔ وہ کہا کرتا ہے کہ فوج میں اس کی کمانڈ پر پوری بٹالین اٹینشن کھڑی ہو جاتی تھی اور اب ایک چھوٹی سی بچی اس کی بات پر کان نہیں دھرتی۔"

میں نے کہا:"اس کے ساتھ تمہارا جھگڑا کس چیز پر ہوتا ہے؟"

اس نے کہا:" کپڑوں کے انتخاب سے لے کر اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ دوستی تک ہر بات پر۔ یوں بھی میں نے اپنے سوالات سے اس کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں پوچھا کرتی ہوں کہ وہ کیوں کر نازی پارٹی میں شامل ہو گیا تھا اور ہٹلر جیسے چیڑ قناتی کو اپنا "فیوہرر" (رہنما) ماننے لگ گیا تھا۔ کیا اس کو نظر نہیں آ رہا تھا کہ یہ پارٹی جرمنی کو جنگ کی طرف لے جا رہی تھی، جس کے نتیجے میں جرمن قوم تباہ ہو جائے گی۔"

میں نے پوچھا:" کیا تمہاری ماں بھی نازی پارٹی کی ممبر تھی؟"

اس نے کہا:" وہ اس زمانے میں ابھی کم عمر تھی اور اپنے ماں باپ کے زیر اثر تھی۔ جب کہ میرا

باپ ملٹری میں افسر تھا۔اس لئے میں اس کو تنقید کا نشانہ بناتی ہوں۔ کیونکہ اس نے ہٹلر اور نازی پارٹی کا ساتھ دیا تھا، جب کہ ان کی سیاست صریحی طور پر ملک اور قوم کے مفادات کے منافی تھی۔"

میں نے کہا:" مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ جرمنی میں نازیوں کے خلاف کسی نے بغاوت نہیں کی۔ کیا اس قوم میں ایک بھی ایسا من چلا نہیں پایا جاتا تھا، جو اپنی جان پر کھیلتے ہوئے ہٹلر پر قاتلانہ حملہ کرتا؟ مجھے یقین ہے کہ اس کے مرنے پر نازی پارٹی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی۔"

اس نے کہا:" نازی پارٹی کے اندر ایسے لوگ موجود تھے، جو ہٹلر کی جگہ لے سکتے تھے۔ جہاں تک ہٹلر پر قاتلانہ حملوں کا تعلق ہے، اس بارے میں شاید تم نہیں جانتے کہ کم وبیش چالیس بار اس پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے گئے، جو مختلف وجوہات کی بنا پر وقت سے پہلے ترک کر دیئے گئے یا ان پر کسی دوسری وجہ سے عمل درآمد نہ ہو سکا۔ مثلاً ایک کو محض اس لئے آخری لمحے میں روک دیا گیا تھا، کیونکہ پلاننگ کے مطابق ہٹلر، ہملر اور گورینگ کو ایک ساتھ بم سے اڑایا جانا تھا، جو اتفاقی طور پر اس روز یکجا نہ تھے۔ ہملر ایس ایس فوج کا کمانڈر تھا اور گورینگ ایئر فورس کا سربراہ تھا اور اس کو ہٹلر نے اپنا جانشین مقرر کر رکھا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ اگر ہٹلر مر گیا اور یہ دونوں زندہ ہوئے، تو ملک خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا:" کیا ہٹلر پر کوئی قاتلانہ حملہ ہوا تھا؟"

اس نے جواب دیا:" ایسے حملے ہوئے تھے، مگر ہٹلر اتفاقی طور پر بچ جاتا رہا۔ پہلی بار ۱۹۳۹ء میں ایک مستری گیورگ ایلسر نے تن تنہا میونخ کے ایک شراب خانے کو بم سے اڑا دینا چاہا تھا، جہاں پر ہٹلر ہر سال ۸ نومبر کی شام کو ۱۹۲۳ء میں ناکام ہو جانے والی بغاوت کی یاد تازہ کرانے کے لئے تقریر کیا کرتا تھا، جس کا اعلان اس نے اسی شراب خانے میں کیا تھا۔ ایلسر کا ارادہ پوری عمارت کو بم سے اڑا دینے کا تھا۔ جس کے لئے اسے بہت محنت کرنی پڑی تھی۔ اس کا طریق کار یہ تھا کہ وہ کئی راتوں تک پب کے بند ہونے سے پہلے عمارت کے اندر کسی جگہ پر چھپ جاتا تھا۔ جب سب لوگ چلے جاتے تھے اور وہ اطمینان کر لیتا تھا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا، تو وہ اس ستون کی طرف جاتا تھا، جس کے پاس ہٹلر بیٹھا کرتا تھا اور جہاں پر تقریر کرنے کے لئے ڈائس رکھا ہوا تھا۔ ایلسر کی پلاننگ یہ تھی کہ اس ستون میں ڈائنامائیٹ ڈالا جائے، جس کے لئے اسے ستون کے اندر ایک سوراخ کرنا تھا، جس میں آلارم کلاک کو بھی رکھا جانا تھا، جس کو وہ ہٹلر کی تقریر کے وقت پر سیٹ کرنا چاہتا تھا۔ عام طور سے ہٹلر لمبی چوڑی تقریر کیا کرتا تھا۔ اس لئے آلارم کلاک کو شام کے نو بج کر اکیس منٹ پر سیٹ کیا گیا تھا۔ مگر اس روز ہٹلر

نے خلاف معمول مختصر تقریر کی، جو نو بج کر سات منٹ پر ختم ہوگئی۔اس کے معاً بعد ہٹلر وہاں سے چلا گیا۔ دھما کا اس کے جانے کے بعد ہوا، جو اتنا زبردست تھا کہ ہال کی چھت پوری کی پوری گر گئی، جس کے نیچے دب کر سات افراد ہلاک ہوگئے اور چھ سو آدمی زخمی ہوئے۔اس چیز سے ہٹلر کے چیلے چانٹوں نے یہ فال نکالی تھی کہ قدرت ان کے "فیوہرر" کی خود حفاظت کرتی ہے، کیونکہ اس سے کوئی بہت بڑا کام لیا جانا مقصود ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ جب میں جرمن شاعر وولفگانگ بیشلر پر کتاب لکھ رہا تھا، تو اسے ملنے کے لئے مجھے میونخ جانا پڑا تھا۔انٹرویو کے دوران اس کے افسانے "جب مجھے ہٹلر نے ناشتے پر بلایا" کا ذکر آ گیا۔میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہٹلر سچ مچ بعض اوقات بچوں کو اپنے دسترخوان پر آنے کی دعوت دیا کرتا تھا۔اس افسانے میں بیشلر نے بیان کیا تھا کہ وہ اپنے چچا کی معیت میں ہٹلر کے ساتھ ناشتہ کرنے کے لئے گیا تھا۔مگر یہ کہانی اس کے ذہن کی تخلیق تھی، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔جب میں نے میونخ کے اس شراب خانے کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا، جس کو ایلسر نے ڈائنامیٹ سے تباہ کر دیا تھا۔تو اس نے کہا کہ اگر اس وقت ہٹلر وہاں پر موجود ہوتا، تو مرنے والوں میں سرفہرست ہوتا۔ چنانچہ وہ مجھے وہاں پر لے گیا۔اس نے اپنے لئے بیئر کا اور میرے لئے انگور کے رس کا آرڈر دیا۔اسی کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ ہٹلر میری طرح نہ تو شراب پیتا تھا اور نہ سگریٹ نوشی کرتا تھا۔پھر اس نے مجھے میونخ کی یونیورسٹی دکھانے کا پروگرام بنالیا، جہاں پر طالب علموں کے ایک گروپ نے شہریوں کو بغاوت کرنے پر اکسانا چاہا تھا، مگر ناکام رہے تھے۔

زیگلنڈے نے کہا:"میں تمہیں اس بارے میں تفصیلات بتا سکتی ہوں۔اس تحریک کا نام "سفید گلاب کے پھول" تھا، جس کے کرتا دھرتا ہانس شول اور اس کی بہن صوفی شول تھے۔دونوں میونخ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ان کے ساتھ پانچ چھ دوسرے افراد بھی شامل تھے، جن کے نام عام طور سے لوگ نہیں جانتے۔ہانس نے جون ۱۹۴۲ء کو پہلا پمفلٹ شائع کیا تھا، جو ڈاک کے ذریعے مختلف افراد کو بھیجا گیا تھا۔فروری ۱۹۴۳ء تک کل چھ ایسے پمفلٹ چھاپے اور تقسیم کئے گئے تھے۔آخری پمفلٹ میں جرمنوں کو کھلم کھلا نازی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔یونیورسٹی کے ایک کارکن نے بہن بھائی کو اوپر کی منزل سے پمفلٹوں کے بنڈل کو بڑے صحن میں پھینکتے ہوئے لیا تھا اور پکڑ کر گستاپو کے حوالے کر دیا تھا۔"

میں نے کہا: "ہیشلر نے مجھے وہ صحن دکھایا تھا، جہاں پر فرش پر سیمنٹ میں اس پمفلٹ کے اوراق کی شبیہ کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ پھر اس نے مجھے پولیٹیکل سائنس کا شعبہ بھی دکھایا، جس کا نام ہانس اور صوفی شول انسٹی ٹیوٹ رکھ دیا گیا تھا۔"

☆☆☆

اس کے بعد مہینوں تک ہمیں مل بیٹھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ زیگلنڈے نے خاص طور پر کہا تھا کہ وہ مجھے ہٹلر پر ہونے والے دوسرے حملے کے بارے میں بتائے گی، جو بدقسمتی سے پہلے حملے کی طرح ناکام رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی سالگرہ کے روز دوپہر کے کھانے پر بلانا چاہا، مگر وہ اس روز نہ آ سکتی تھی، کیونکہ امتحان کے دن قریب تھے اور عین اس روز ٹیوٹوریل رکھا گیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد میری دعوت قبول کرے گی اور اس شخص کے ایک عزیز کو اپنے ساتھ لائے گی، جس نے ہٹلر پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور جس کے نتیجے میں اس کے خاندان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

امتحان ختم ہونے پر میں نے اپنی دعوت طعام کا اعادہ کیا اور یاد دلایا کہ وہ کسی دوست کو اپنے ساتھ لانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ اس شخص کے ساتھ اس کی اس دوران میں منگنی ہو چکی ہے۔ چنانچہ وہ کرسٹوفر کی معیت میں آئی۔ جس کا تعارف اس نے یہ کہہ کر کرایا کہ وہ گراف فان شٹاؤفن برگ کا بھانجا ہے، جس نے ہٹلر کو بم سے اڑا دینا چاہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کرسٹوفر کی عمر تیس کے لگ بھگ ہو گی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ وکیل تھا اور ہائیڈل برگ میں رہتا تھا۔ جہاں پر زیگلنڈے کو عدالت میں اپرنٹس شپ مل رہی تھی۔ اب صرف امتحان کا نتیجہ نکلنے کی دیر تھی، جو آئندہ دنوں میں متوقع تھا۔

کرسٹوفر سے میں ہٹلر پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بارے میں وہ باتیں سننے کا خواہشمند تھا، جو اس کی فیملی میں بیان کی جاتی تھی۔ میں گراف فان شٹاؤفن برگ کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ ابتداء میں نازی پارٹی کا سرگرم رکن اور ہٹلر کا مداح رہ چکا تھا۔ مگر یہودیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم اور مشرقی یورپ کے باسیوں کے ساتھ کیا جانے والا سلوک اور سب سے بڑھ کر جس طریق سے جرمنی جنگ لڑ رہا تھا، اس کے ساتھ وہ اتفاق نہیں رکھتا تھا۔ سویٹ یونین پر حملہ کرنا ہٹلر کی سب سے بڑی غلطی شمار کی جاتی تھی۔ جس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ سٹالن گراڈ میں جرمن فوج کو دو برسوں

تک محاصرہ کرنے کے بعد شکست ہو چکی تھی۔ ڈھائی تین لاکھ جرمن فوجی مارے گئے تھے اور پندرہ سولہ لاکھ روسی بھی جنگ کے صرف اس محاذ پر کام آئے تھے۔

کرسٹوفر نے کہا: "سٹالن گراڈ میں شکست کے بعد ملک میں عام طور سے نازی حکومت کے خلاف عوام میں بہت غصہ پایا جاتا تھا، مگر نازی ڈکٹیٹر شپ کے آگے کسی کی نہیں چلتی تھی۔ البتہ فوج کے افسروں میں خفیہ طور پر ملک کو نازی پارٹی سے نجات دلانے کے لئے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ اس وقت تک ملک کے سارے مرد جنگ کی بھٹی میں ڈالے جا چکے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ نوعمر لڑکے بالے اور بڈھے بابے بھی ملک کے دفاع کے لئے جبری طور پر بھرتی کئے جا رہے تھے۔ دوسری طرف ملک کے کارخانوں کو چلانے کے لئے مشرقی یورپ کے ممالک سے لاکھوں انسان جبری طور جرمنی لائے گئے تھے۔ جس کے سبب عام طور سے یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ یہ غیر ملکی عناصر کسی وقت بھی ملک میں انارکی پھیلا سکتے ہیں۔ اس لئے حکومت کی طرف سے ایسی ایمرجنسی کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک خفیہ پلان بنایا جا رہا تھا۔ چنانچہ جن فوجی افسروں کے ہاتھ میں اس کی پلاننگ تھی، ان میں میرا ماموں بھی شامل تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایسی صورت حال پیدا ہونے پر فوج ملک کی حکومت پر قبضہ کر لے گی اور نازی پارٹی کے ان ممبروں پر الزام دھرا جائے گا، جو جنگ کے فرنٹ سے دور جرمنی میں بیٹھے ہوئے حکومت کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔"

میں نے پوچھا: "گراف فان شٹاؤفن برگ کے ساتھ کون لوگ سازش میں شریک تھے؟"

اس نے کہا: "سازش کرنے والوں میں کئی ایک سینئر فوجی افسر شامل تھے، جن کو انقلاب کے کامیاب ہونے پر حکومت سنبھالنی تھی۔ البتہ سوال یہ تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھتا ہے یا دوسرے الفاظ میں ہٹلر کو راستے سے کون ہٹاتا ہے۔ ماموں ہٹلر کے ہیڈ کوارٹر میں فوجی مشاورت کے اجلاسوں میں شامل ہوتے تھے، اس لئے یہ کام ان پر ڈال دیا گیا، کیونکہ ان کی تلاشی نہیں لی جاتی تھی۔ البتہ ماموں تھوڑا عرصہ قبل ایک ہوائی حملے میں بہت بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی اور دائیاں ہاتھ ناکارہ ہو گیا تھا اور بائیں ہاتھ کی بھی دو انگلیاں کٹ گئی تھیں۔ اس وجہ سے بم کو شارپ کرنا ان کے لئے اتنا آسان نہ تھا۔ ان کے لئے ایک خاص زنبور اس کام کے لئے بنایا گیا تھا، تاکہ وہ اپنی باقی ماندہ تین انگلیوں سے کام چلا سکیں۔ ان کو اجلاس کی میز پر ہٹلر سے کچھ ہٹ کر بیٹھنے کے لئے کرسی ملی تھی، جس کے نیچے انہوں نے اپنا بیگ زمین پر رکھ دیا تھا، جس میں ایک بم کو شارپ کیا جا چکا

تھا، جسے چند منٹوں کے بعد پھٹنا تھا۔ دوسرے بم کو وہ میٹنگ روم میں جانے سے پہلے کسی جگہ رکھ گئے تھے۔اس لئے اجلاس کے شروع ہوتے ہی ماموں نے دوسرے کمرے سے ٹیلی فون کرنے کے لئے اجازت چاہی اور بیگ کو بم سمیت میز کے نیچے چھوڑ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ بلکہ وہاں سے سیدھے ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے، کیونکہ ان دنوں ہٹلر کا ہیڈ کوارٹر برلن کی بجائے ایسٹ پروشیا کے ایک مقام پر تھا۔ جب بم پھٹا تو ماموں نے گمان کیا کہ ہٹلر اور اس کے ساتھ دوسرے سب لوگ مر گئے ہوں گے۔ جب کہ درحقیقت صرف چار افراد ہلاک ہوئے تھے، جن میں ہٹلر شامل نہ تھا۔ اگر یہ اجلاس کنکریٹ سے بنے ہوئے تہہ خانے میں ہو رہا ہوتا اور دھماکے کا پریشر عمارت سے باہر نہ نکل سکتا تو یقیناً سب شرکاء مارے جاتے۔مگر اس روز کی میٹنگ ایک چوبی بیرک میں رکھی گئی تھی، جس میں بم کا دھماکا متوقع تباہی نہ برپا کر سکا۔ اگر دوسرا بم بیگ میں موجود ہوتا، تو اس کے پھٹنے پر دھماکہ دوگنی تباہی کر سکتا تھا"۔

میں نے پوچھا: "میں نے پڑھ رکھا ہے کہ گراف فان شٹاؤفن برگ کو اسی رات چند دوسرے فوجی افسروں سمیت گولی مار دی گئی تھی اور اس کے بھائی کو ایک ماہ بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ تمام اہل خانہ اور دوسرے رشتہ داروں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور بچوں کو ان کے ماں باپ سے جدا کر دیا گیا تھا۔"

اس نے کہا۔ "نہ صرف جدا کر دیا گیا تھا بلکہ ان کو نئے نام دیئے گئے تھے۔منصوبہ یہ تھا کہ ان کے دلوں سے اپنے خاندان کی یادداشت محو کر دی جائے اور اگر ان کو زندہ رہنے دیا جائے، تو صرف اس صورت میں کہ ان کو غیر لوگوں کے حوالے کر دیا جائے۔مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ نازی جرمنی کو بہت جلد اتحادی فوجوں کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی اور کانسٹریشن کیمپوں کا خاتمہ ہوا۔جس کے نتیجے میں اس کے خاندان کے بہت سے افراد کی جان بچ گئی اور وہ اپنے بچوں کو دوبارہ حاصل کر پائے۔"

☆☆☆

تھوڑے دنوں کے بعد زیگفرائڈ نے بتایا کہ اس کے امتحان کا نتیجہ نکل آیا تھا اور وہ کامیاب ہو گئی تھی۔اس نے کہا کہ اس خوشی میں اس کا باپ اپنے گھر پر ایک پارٹی دے رہا ہے، جس میں مجھے بھی

شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔اس سلسلے میں اسے میرا ڈاک کا پتا درکار تھا۔چنانچہ چند دنوں کے بعد مجھے چھپا ہوا دعوت نامہ مل گیا،جس میں درج تھا کہ مرد شرکاء محفل سے درخواست ہے کہ سموکنگ سوٹ میں حاضر ہوں۔میرے پاس ایسا سوٹ نہیں تھا اور محض ایک پارٹی میں شمولیت کی خاطر میں اسے خریدنے کے لئے تیار نہیں تھا۔اس لئے میں نے شامل ہونے سے معذرت کرنے کے لئے زیگلنڈے کو فون کیا۔اسے بھی یہ بات ناگوار گزری تھی کہ باپ نے دعوت نامے میں یہ شرط رکھ دی تھی۔ اس نے کہا میرے باپ گراف روڈولف فان گرسٹن ڈورف کی جاگیر تو جاتی رہی ہے،مگر جاگیردارانہ طور اطوار نکالے نہیں نکلتے۔اس نے بتایا کہ سموکنگ کرائے پر بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ تم اپنا قومی لباس پہن کر بھی تو آسکتے ہو۔اس طرح میری مشکل حل ہوگئی اور میں کالی اچکن،سفید لٹھے کی شلوار بوسکی کی قمیص اور سر پر جناح کیپ رکھ کر حاضر ہوگیا۔

گراف فان گرسٹن ڈورف نے اس موقعے پر ایک تقریر کی،جس میں اس نے اپنی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس شام اپنی زندگی کا ایک ایسا راز کھول رہا ہے۔جس کو اس نے اس وقت تک اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔اس کا تعلق اس چیز سے ہے کہ اس نے جنگ کے دوران ہٹلر پر قاتلانہ حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا،جو دراصل ایک خودکش حملہ تھا۔یہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کی بات ہے،جس روز جرمنی میں ہر سال پہلی جنگ عظیم میں مارے جانے والے ہم وطنوں کی یاد میں قومی ماتم منایا جاتا تھا۔نازی پارٹی نے اس کا نام بدل کر "قومی سپوتوں کا یادگار دن" رکھ چھوڑا تھا۔اس زمانے میں وہ برلن میں پائے جانے والے فوجی میوزیم کا کمانڈر تھا۔جہاں پر دشمن سے چھینے جانے والے اسلحے کی نمائش کا انتظام کیا گیا تھا۔اس کا افتتاح پروگرام کے مطابق ہٹلر کو کرنا تھا۔چونکہ اس کو ہٹلر کا استقبال کرنا تھا اور اس کو نمائش دکھانی تھی،اس لئے اس نے سوچا کہ ہٹلر کو مارنے کا یہ بہترین موقع ہوگا۔البتہ اسے پتا تھا کہ پستول سے حملہ کرنا آسان نہیں ہوگا،کیونکہ ہٹلر کے محافظ بہت چوکس ہوا کرتے تھے۔اس لئے اس نے ٹائم بم استعمال کرنے کا ارادہ کیا۔مگر اس سلسلے میں یہ چیز حائل تھی کہ ٹائم کلاک کی ٹک ٹک وقت سے پہلے راز کھول سکتی تھی۔اس کے پاس دو انگریزی مائنز تھیں،جن کو چلانے کے لئے تیزابی عمل کام میں لایا جاسکتا تھا،جو بے آواز ہوتا ہے،مگر جس کے ذریعے مائنز کو چلانے پر دس پندرہ منٹوں کا وقفہ درکار ہوتا تھا۔ پروگرام کے مطابق ہٹلر کو افتتاحی تقریر کے بعد بیس منٹوں تک نمائش دکھائی جانی تھی۔گویا تیزابی عمل سے مائنز کو چلانے کے لئے کافی وقت مل سکتا تھا۔

ہٹلر کی تقریر بارہ منٹوں کی تھی، جس کے خاتمے پر گراف فان گرسٹن ڈورف نے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھی ہوئی مائنز کو چلانے کی خاطر تیز ابی عمل کا بٹن دبا دیا۔ مگر ہٹلر نمائش کے لئے رکھے ہوئے اسلحے کے پاس سے بگولے کی طرح گزر گیا۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں رکا اور تیز رفتاری سے ڈگ بھرتا ہوا میوزیم کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ گراف فان گرسٹن ڈورف کو پتا تھا کہ اس کی جیب میں رکھی ہوئی مائنز بارہ پندرہ منٹوں کے اندر پھٹ جائیں گی۔ اس لئے ضروری تھا کہ تیز ابی عمل کو روکا جائے۔ چنانچہ وہ دوڑتا ہوا قریبی ٹائیلٹ میں گیا، جہاں پر اسے تیز ابی عمل کو روکنے میں کامیابی ہوئی۔ اس طرح اس کا حملہ ناکام رہا۔

حاضرین محفل نے دل کھول کر گراف فان گرسٹن ڈورف کو داد دی۔ زیگلنڈ ے مبارک داد دینے والوں میں سب سے آگے تھی۔ وہ اپنے باپ پر بے حد فخر مند تھی۔

☆☆☆

برسوں کے بعد مجھے جرمنی کے مرکزی فلم آرکائیوز میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں پر جنگ کے زمانے کی مختصر فلمیں محفوظ ہیں، جو ہر ہفتے ملک کے سینما گھروں میں فلم سے قبل دکھائی جاتی تھیں۔ ٹیلی ویژن کے رواج پانے سے قبل ان فلموں کے ذریعے ہفتے بھر کی اہم خبریں عوام تک پہنچائی جاتی تھیں۔ میں نے آرکائیوز کے کارکن سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کی فلم دیکھا سکتا ہے، جو فوجی میوزیم برلن میں دشمن سے چھینے جانے والے اسلحے کی نمائش کی افتتاح کے موقعے پر بنائی گئی تھی۔ منٹوں کے اندر وہ فلم نکال لایا، جس میں ہٹلر کو افتتاحی تقریر کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ معاینے کے وقت میوزیم کا کمانڈر گراف فان گرسٹن ڈورف اس کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ اوور کوٹ کے بغیر تھا، جس کی جیب میں اس نے مائنز کو دھماکے کی خاطر رکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔

(کمر فیلڈ۔ ۲۲ نومبر ۲۰۰۶ء)

آدھا بوجھ

انسٹی ٹیوٹ کے بالمقابل کتابوں کی دوکان "آرٹ ورلڈ" کے کھل جانے پر مجھے اتنی خوشی ہوئی جیسے اکیلے میرے لئے عید کا چاند نکل آیا ہو۔ یہ بھی نہیں ہے کہ ہمبرگ میں کتابوں کی دوکانوں کی کمی تھی۔ بس وہ اس علاقے میں نہیں پائی جاتی تھیں، جہاں پر میرا ہر روز آنا جانا تھا۔ مجھے خاص طور پر آدھا پونا دن نکال کر نئی کتابیں دیکھنے کے لئے یونیورسٹی کمپس میں جانا پڑتا تھا، جو میری انسٹی ٹیوٹ سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ چونکہ عام طور سے میرے لئے اپنے دن بھر کے مصروف پروگرام میں سے وقت نکالنا آسان نہ تھا، اس لئے بعض اوقات مہینوں تک کتابوں کی دوکانوں کا طواف ملتوی رکھنا پڑتا تھا۔

"آرٹ ورلڈ" کے کھلنے پر میں پہلے ہی روز ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ اٹھائے ہوئے دوکان کے کارندوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے پہنچ گیا۔ وہاں پر اس وقت افتتاح کی تقریب منعقد ہو رہی تھی، جس کے سبب دوکان میں لوگوں کا اچھا خاصا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ میرا استقبال دوکان کی مالکہ نے کیا اور دوسروں کی طرح خوش آمدید کے مشروب کا ایک گلاس میرے ہاتھ میں بھی تھما دیا گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہو گی۔ اس نے حاضرین کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنا نام ایلکے بتایا اور کہا کہ اس کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے، جو تین نسلوں سے کتب فروشی کا کاروبار کرتا آیا ہے اور دوبار دوکان کے بند کئے جانے کے باوجود اس پیشے کو اپنائے ہوئے ہے۔ پہلی بار نازی پارٹی کے ایماء پر اس کے نانا کی دوکان کو تیسری دہائی میں برلن میں آگ لگا دی گئی تھی، کیونکہ وہاں پر یہودی اور کمیونسٹ ادیبوں کی کتابیں کھلے بندوں بکتی تھیں۔ اس کے تیس برس بعد مشرقی جرمنی کی کمیونسٹ حکومت نے اس کی ماں کی دوکان کو بحق سرکار ضبط کر لیا تھا، کیونکہ وہاں پر مغربی جرمنی کے ادیبوں کی کتابیں چوری چھپے فروخت ہوتی تھیں، جن کی درآمد اس ملک میں ممنوع تھی۔ اب تیسری بار اس نے ہمبرگ میں دوکان کھولی تھی، جو برلن کے بعد مغربی جرمنی کا دوسرا بڑا شہر ہے اور امید رکھتی تھی کہ

اس جمہوری ملک میں اس کی دوکان پر ایسی کوئی قید نہیں لگائی جائے گی۔ وہ اپنی دوکان پر ہر قسم کا لٹریچر رکھنا چاہتی تھی، جس میں مشرقی جرمن ادیبوں کی کتابیں بھی شامل ہوں گی۔ اس زمانے میں کمیونسٹ ادیبوں کی کتابیں دوکانوں میں رکھنے پر مغربی جرمنی میں پابندی تو نہیں تھی، مگر عام طور سے ایسا لٹریچر ڈھونڈے سے بھی کہیں پر نہیں ملتا تھا۔ یہ بات میرے لئے ایک خوشخبری کے مترادف تھی، کیونکہ میں ایک عرصے سے ایسی کتابوں کی تلاش میں سرگرداں پھرتا تھا۔

ایلکے نے کہا کہ حساب کتاب سے اس کی جان جاتی ہے۔ اس کے باوجود وہ دل و جان سے کاروباری ہے اور کتب فروشی کو ایک فن سمجھتی ہے۔ دوسری طرف تجارت کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ منافع کمایا جائے، کیونکہ خسارے پر کوئی کاروبار بہت دنوں تک نہیں چل سکتا۔ وہ امید رکھتی تھی کہ اسے فن اور کاروباری اصولوں کے درمیان پائے جانے والے پل صراط پر چلنے کا ڈھنگ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ آ جائے گا۔ یوں بھی اس نے ایک لائق فائق اکاؤنٹنٹ کی خدمات حاصل کر لی تھیں، جو اس کا دست راست ہوگا اور امید ہے کہ قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ کتب فروشی کی باقاعدہ ٹریننگ اس نے اپنی ماں سے حاصل کی تھی، جس کی دوکان کو مشرقی جرمنی کی حکومت نے ضبط کر لیا تھا، مگر اس کو مغربی جرمنی ہجرت کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تاہم ماں بیٹی کسی طریق سے چھپ چھپا کر ملک سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابھی مشرقی جرمنی میں کمیونسٹ حکومت پوری طرح مستحکم تھی اور سویٹ یونین کی عمارت میں دراڑ نہیں پڑے تھے اور برلن کی دیوار نے جرمنی کے سب سے بڑے شہر کو دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ دوسرے لفظوں میں دنیا کمیونسٹ بلاک اور ناٹو کے درمیان ہونے والی "سرد جنگ" کے پنجے میں تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دوکان میں ادب کا شعبہ خاصا بڑا تھا۔ بالخصوص نئے شاعروں کی کتابوں سے ایک پوری الماری بھری پڑی تھی۔ بہت سے شاعروں کے نام میرے لئے نئے تھے۔ میں نے اس وقت تک ان کی کوئی نظم نہیں پڑھی تھی۔ صرف یہی نہیں دوکان میں ماڈرن جرمن افسانہ نگاروں کی کتابیں بھی بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ جرمنی میں پبلشروں کی مشترکہ فہرست کی مدد سے ہر قسم کی کتابیں کتب فروشوں کے ذریعہ منگوائی جا سکتی ہیں، جس پر عام طور سے چوبیس گھنٹے بھی نہیں لگتے، کیونکہ ہر بڑے شہر میں گروس اسٹاکسٹ موجود ہیں، جن کے ہاں تمام ایسی کتابیں رکھی جاتی ہیں، جو مارکیٹ میں فروخت کے لئے مہیا ہیں۔ مجھے پتا تھا کہ آئندہ دنوں اور ہفتوں میں میرا بہت سا وقت اس

دوکان میں ان کتابوں کو دیکھنے میں گذرے گا۔ اور کون جانتا ہے کہ وہاں پر کیسے کیسے انمول ہیرے اور موتی ہاتھ لگیں گے۔ میں اس زمانے میں عصری جرمن ادب کے چنیدہ ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ کر رہا تھا۔ چونکہ دوکان انسٹی ٹیوٹ کے بالمقابل تھی، اس لئے مجھے امید تھی کہ میں آسانی کے ساتھ فرصت کے اوقات وہاں پر گذار سکوں گا۔

چنانچہ دوپہر کے کھانے کے وقفے میں "آرٹ ورلڈ" کا چکر لگانا میرا آئے دن کا معمول بن گیا۔ وہاں پر ایک کونے میں میز اور کرسیاں لگا دی گئی تھیں، جن پر بیٹھ کر انسان اطمینان کے ساتھ کتابوں کی ورق گردانی کر سکتا تھا۔ یہ چیز میں نے اس سے قبل کتابوں کی کسی دوسری دوکان میں نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے میں نے ایلکے کو "ریڈنگ کارنر" بنانے پر مبارک باد دی۔ ایلکے نے کہا کتابوں کی خریداری سے پہلے گاہک کو چھان پھٹک کے لئے وقت ملنا چاہیئے اور اطمینان سے بیٹھنے کے لئے مناسب انتظام ہونا چاہیئے۔ خاص طور پر "ریڈنگ کارنر" میں آکر بیٹھنے والوں کے لئے مفت میں ملنے والی چائے اور کافی کا انتظام بھی موجود تھا۔ اس زمانے میں عام طور سے اس رسم کا جرمنی میں ابھی رواج نہیں ہوا تھا۔ آج کل آپ بال کٹوانے کے لئے باربر کی دوکان پر جاتے ہیں، تو اپنی باری کے آنے تک انتظار کے دوران آپ کو مفت کافی پیش کی جاتی ہے۔ مگر کتابوں کی دوکانوں میں ایسا انتظام اب بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ ایلکے نے اس سلسلے میں پہل کی تھی، جس کا بہت جلد کتابوں کے شائقین میں چرچا ہو گیا تھا اور وہ بڑی تعداد میں "آرٹ ورلڈ" کا چکر لگانے لگے تھے۔ البتہ مجھے یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی تھی کہ کافی کی پیالی ملنے پر بعض لوگ سگریٹ سلگا لیتے تھے، جس کے سبب مجھ جیسے لوگوں کو، جو اس "نعمت" سے محروم ہیں، ان کا اگلا ہوا دھواں برداشت کرنا پڑتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کتابوں کی دوکانوں میں سگریٹ نوشی اس زمانے میں بھی سختی سے منع تھی۔ مگر جرمن محاورہ ہے کہ جہاں پر کوتوال موجود نہ ہو، وہاں پر بھلا کون چھوٹے موٹے قوانین کی پرواہ کرتا ہے۔

ایلکے نے بتایا کہ وہ شاعروں اور ادیبوں کو اپنے ادب پارے پیش کرنے کے لئے "آرٹ ورلڈ" میں بلانے کی رسم ڈال رہی تھی، جن کو دیا جانے والا معاوضہ بلدیہ ہمبرگ کے کلچرل فنڈ سے ملنے کی امید کی جا سکتی تھی۔ اس کی دوکان خاصی وسیع و عریض تھی، جس میں تیس چالیس فولڈنگ کرسیاں لگ سکتی تھیں۔ ایسے پروگرام عام طور سے شام کے وقت بازاروں کے بند ہونے کے بعد رکھے جاتے ہیں جب لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں اور اندرون شہر کا علاقہ خاصا اجاڑ ہو چکا ہوتا ہے۔ یوں بھی

ہمبرگ کے بارے میں یار لوگ کہا کرتے ہیں کہ اس شہر میں شام پڑنے پر فٹ پاتھ سمیٹ لئے جاتے ہیں۔ اس لئے میرا اندازہ تھا کہ بہت زیادہ سامعین شمولیت کے لئے نہیں آئیں گے۔ مگر جب ایک نامور شاعر کو بلایا گیا اور خبر مقامی اخباروں میں چھپی، تو اس کو سننے اور دیکھنے کے لئے اتنے لوگ آئے کہ دوکان میں تل رکھنے کے لئے بھی جگہ باقی نہ بچی اور کرسیاں کم پڑ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے "آرٹ ورلڈ" کا چرچا شہر کے ادبی حلقوں میں ہونے لگا اور دور دور سے ادب دوست آنے لگے۔ بلکہ ایک ادبی گروپ کی ماہوار میٹنگ بھی وہاں پر منعقد ہونے لگی، جس میں نئے لکھنے والے اپنے ادب پارے پیش کرتے تھے۔ اس طرح دوکان کے دوستوں کا ایک مستقل حلقہ پیدا ہو گیا، جس نے اپنی پہچان کے لئے ایک خاص بیج بنا کر اپنے کوٹوں کی جیبوں اور قمیص کے کالروں پر لگانے کی رسم ڈال دی۔ یہ چیز جرمنی میں بہت مقبول ہے۔ یہاں تک کہ کبوتر بازوں اور کتے پالنے والوں کی انجمنوں کے ارکان بھی اپنے اپنے بیجوں سے پہچانے جاتے ہیں۔

پچھلی صدی کی نویں دہائی میں برلن کی دیوار کے گرنے کے اسباب پیدا ہو گئے اور مشرقی جرمنی کے باسی لاکھوں کی تعداد میں ہر روز اپنے ملک پر پشت پھیرنے لگے۔ ان لوگوں کو شاید خطرہ تھا کہ کہیں یہ نادر موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ کون جانتا ہے کہ یہ خواب کب ٹوٹ جائے گا اور جب آنکھ کھلے گی تو کیا منظر دیکھنے کو ملے گا۔ ہوسکتا ہے کہ ملک سے ہجرت کرنے کی سہولت چھین لی جائے۔ خصوصاً نوجوان طبقے میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور وہ اپنے ننھے بچوں تک کو اکیلا چھوڑنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ ان دنوں بے شمار ایسے واقعات کا چرچا اخباروں میں ہو رہا تھا کہ میاں بیوی بچوں کو اپنے کسی رشتہ دار یا واقف کار کے پاس چھوڑ کر مغربی جرمنی ہجرت کر گئے تھے اور عرصہ تک اپنے لواحقین کو خبر نہ دی تھی کہ کہاں پر ہوتے ہیں اور کب اپنے بچوں کو لینے کے لئے آئیں گے۔ پیچھے شہروں اور قصبوں میں بڈھے بابے باقی بچے تھے یا ایسے لوگ جو سفر کرنے سے جسمانی طور پر معذور تھے۔

"آرٹ ورلڈ" کی تینوں ملازم لڑکیاں بڑی مہذب اور اپنے اپنے کام میں کامل مہارت رکھنے والیاں تھیں۔ یوں تو تینوں خوبصورت تھیں، مگر ان میں سے ایک، جس کا نام سیگی تھا اور جو برلن کی دیوار کے گرنے کے بعد مشرقی جرمنی سے ہجرت کر کے آئی تھی، کسی بھی مقابلہ حسن میں اول انعام حاصل کر سکتی تھی۔ اسے شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا اور وہی میرے لئے نت نئے شاعروں کو ڈھونڈتی اور ان کی کتابیں مہیا کیا کرتی تھی۔ وہ اس کام کے لئے شاعری کے انڈر گراونڈ میں ملنے والے مجلّات کی ورق

گردانی کرتی تھی اور ہر دوسرے تیسرے ہفتے کوئی نیا نام نکال لاتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان شاعروں کی نظمیں مجھے کم ہی متاثر کر پاتی تھیں۔ پچھلی صدی کی ساتویں، آٹھویں اور نویں دہائیوں میں جرمن ادیب وشاعر اپنی مادری زبان کے ساتھ زبردستی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ لفظوں کے جوڑ توڑ سے نئی نئی تراکیب پیدا کی جارہی تھیں، جن کو اکثر فیشن کے مارے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیاں لے اڑتے تھے۔ اسی طرح سلینگ اور مقامی بولیاں جرمن زبان کا حلیہ بگاڑنے میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہی تھیں۔ دوسری طرف امریکن انگریزی بڈھے یورپ کو جنگ لڑے بغیر فتح کر رہی تھی۔ یہ کام امریکی فلموں اور ٹیلی ویژن پروگراموں کی مدد سے سرانجام پا رہا تھا۔ جس کے خلاف میں یا دوسرے بزعم خود "زبان کے محافظ" کڑنے کے سوا کچھ نہیں کر پاتے تھے۔ زبانیں اسی طرح ترقی کرتی ہیں۔ بعض اوقات ان کا قدم آگے کی طرف بڑھتا ہے، جس پر آنے والی نسلیں خوش ہوتی ہیں۔ مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ معکوس ترقی کا شکار بن کر اپنی شکل وصورت بگاڑ لیتی ہیں۔

تھوڑے دنوں میں مجھے شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ میں اکیلا سیگی کا مداح نہیں تھا۔ اس کے چاہنے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا، جن میں ہر عمر کے لوگ شامل تھے۔ پھر یہ چیز صرف مردوں تک محدود نہ تھی، عورتیں بھی اس کا کلمہ پڑھتی تھیں۔ گاہکوں میں اس کی ہر دل عزیزی کے سبب اس کے ساتھ بات کرنے کے لئے بعض اوقات اچھا خاصا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس چیز کو اس کی کولیگ سیلز گرلز بھی محسوس کرنے لگی تھی، کیونکہ ان کی مانگ مندی پڑتی جارہی تھی۔ خود مالکہء دوکان ایلکے کی موجودگی میں گاہک کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں سیگی سے مشاورت کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جب کبھی سیگی کی دوکان سے عدم موجودگی میں گاہک اس کے بارے میں پوچھتے تھے تو ایلکے ان کو ٹالنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بسا اوقات یوں لگتا تھا جیسے وہ سیگی سے چڑنے لگی تھی۔ حساب کتاب کے سلسلے میں دوکان کا اکونٹنٹ بھی اکثر اس کی بجائے سیگی سے مشورہ کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا، جس کی رائے بہت سلجھی ہوئی اور نپی تلی ہوتی تھی۔ سیگی بہت محتاط تھی اور ایلکے کو شکایت کا موقع نہ دیتی تھی۔ یوں بھی وہ جانتی تھی کہ مالکہ دوکان سے ٹکر لینے میں کچھ نہیں دھرا۔

ایلکے جان گئی تھی کہ سیگی مجھے اچھی لگتی تھی۔ بلکہ درست ہوگا اگر کہا جائے کہ میں دل ہی دل میں اس سے پیار کرنے لگا تھا، اگرچہ میں نے کبھی ایلکے یا کسی اور کے سامنے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ تاہم ایلکے اس چیز کو تاڑ گئی تھی اور جب کبھی سیگی دوکان پر موجود نہ ہوتی تھی اور میں آن نکلتا تھا، تو مجھے

ستانے کے لئے اس امر پر سخت افسوس کا اظہار کرتی تھی کہ بدقسمتی سے میری پسندیدہ سیلز گرل سیگی اس وقت موجود نہیں ہے۔لیکن میں چاہوں،تو وہ بذات خود میری خدمت کرنے کے لئے تیار ہے۔میں اکثر ہنسی مذاق میں بات کو ٹال دیتا تھا۔

ایک روز میں نے سیگی سے پوچھا کہ وہ مشرقی جرمنی سے ہجرت کرنے سے پہلے کس شہر میں رہتی تھی۔اس نے" ہالے" کا نام لیا،جس کے بارے میں مجھے پتا تھا کہ اسی شہر میں ایلکے کی ماں کی دوکان ہوا کرتی تھی۔اس بارے میں پوچھنے پر اس نے کہا کہ وہ ایلکے کی ماں کو اچھی طرح جانتی تھی۔بلکہ ایلکے سکول میں اس کی کلاس فیلو تھی اور دونوں نے ایک ساتھ سیلز مین شپ کی تربیت ایلکے کی ماں کی دوکان پر حاصل کی تھی،جس کو بعد میں ایک سرکاری ادارے نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔اس حکم کے خلاف عدالت میں اپیل داخل کرائی گئی تھی،مگر ماں بیٹی نے مقدمے کے فیصلے کا انتظار نہیں کیا تھا اور کسی طریق سے چھپ چھپا کر مغربی جرمنی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھیں،جہاں پر چند برسوں کے بعد ایلکے کی ماں سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر مر گئی تھی۔ہالے میں سیگی آخر تک اسی سرکاری دوکان میں ملازمت کرتی رہی تھی۔اس لئے جب اس نے ہجرت کرنے کا ارادہ باندھا تو یہ جانتے ہوئے کہ ایلکے نے ہمبرگ میں کتابوں کی دوکان کھول لی تھی،اس نے اس شہر کا انتخاب کیا تھا۔البتہ اسے پتا نہیں تھا کہ آیا ایلکے اس کو اپنی دوکان میں ملازمت دینے کے لئے تیار بھی ہوگی یا نہیں۔اس کا خدشہ بے بنیاد نکلا۔ایلکے نے اس کا استقبال کھلے بازوؤں سے کیا۔بلکہ ابتداء میں اس کو اپنے گھر میں رہنے کے لئے ایک کمرہ بھی دیا تھا،جس پر اس کو آگے چل کر شاید افسوس ہوا تھا۔کیونکہ سیگی کو اس کے خاندان کے ایک خفیہ راز کا پتا چل گیا تھا،جس کی حفاظت ماں بیٹی ایک عمر سے آنکھ کی پتلی کی طرح کرتی آئی تھیں۔

اس چیز کا تعلق ایک تصویر سے تھا،جس کو ایلکے نے اپنے کمرے میں لگا رکھا تھا۔یہ اس کے بچپن کی واحد تصویر تھی،جس میں اس کی ماں نے دو بچیوں کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ان میں سے ایک ایلکے تھی اور دوسری اس کی توام بہن سلکے تھی،جس کے بارے میں عام طور سے کہا جاتا تھا کہ ایلکے کی ماں نے اسے بیچ دیا تھا یا شاید مار ڈالا تھا۔سیگی نے اپنی ماں سے سن رکھا تھا کہ اس وجہ سے اس پر مقدمہ بھی چلایا گیا تھا۔مگر چونکہ یہ بات سیگی کے ہوش سے پہلے کی ہے،اس لئے وہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔اس نے جب اس بارے میں ایلکے سے پوچھا،تو وہ سخت تلملائی تھی۔پہلے تو وہ اس موضوع پر کچھ بھی بتانے کے لئے تیار نہیں تھی،مگر چونکہ سیگی پوچھ بیٹھی تھی،اس لئے اسے کہتے ہی بنی کہ اس کی توام بہن کو اس کا باپ اپنے ساتھ

آسٹریلیا لے گیا تھا۔ اسے خود اپنے باپ کی، جس نے کبھی بھول کر بھی اس کی خبر نہ لی، شکل وصورت تک یاد نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اس کی سالگرہ کے موقع پر یا کرسمس کے تہوار پر تہنیت کا کارڈ تک نہ بھیجا تھا۔ ان کے گھر پر اس کے باپ کی ایک بھی تصویر نہیں تھی۔ ماں نے غصے میں آ کر اس کی اور خود اپنی جوانی کی ساری تصویریں پھاڑ کر جلا ڈالی تھیں اور بیٹی کو باپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، سوائے اس کے کہ وہ بہت غیر ذمہ دار انسان تھا، جو اس کو عین جوانی میں ایک دوسری عورت کی خاطر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور جاتے ہوئے اس کی بہن کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

جب میں نے اس بارے میں مزید تفصیلات جاننے کے شوق کا اظہار کیا، تو سیگی نے مجھے خبردار کر دیا کہ ایلکے کے سامنے اس چیز کا بھول کر بھی ذکر نہ کروں، وگرنہ اس کی نوکری کی خیر نہیں۔ میں نے اسے اطمینان دلایا اور کہا کہ اس قسم کی باتوں کا سراغ اخباروں کے آرکاویز سے لگایا جا سکتا ہے، جہاں پر ملک کی اہم اخبارات کی فائیلیں محفوظ رکھی جاتی ہیں اور ہر کوئی ان کا نکلوا کر دیکھ سکتا ہے۔ مگر مجھے اس وقت پتا نہیں تھا کہ کیا ہمبرگ کے آرکاویز میں مشرقی جرمنی کے اخبارات موجود بھی ہیں یا نہیں۔ تفتیش کرنے پر وہاں پر مشرقی جرمنی کے سرکاری اخبار "نویس ڈوئچ لانڈ" کی مکمل فائل نکل آئی۔ مغربی جرمنی کے اخباروں میں اس مقدمے پر شاید ہی خبریں چھپی ہوں گی، کیونکہ ان کے نمائندے اس زمانے میں مشرقی جرمنی میں نہیں ہوتے تھے۔

سیگی کے بیان کے مطابق ایلکے کی عمر اس کی ماں پر چلنے والے مقدمے کے وقت دو اڑھائی سال کے لگ بھگ تھی۔ گویا اس چیز کا تعلق پینتیس اور چالیس برس قبل کے درمیانی عرصے سے تھا۔ چونکہ عورتوں سے ان کی عمر پوچھنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے اور کوئی شریف آدمی اس چیز کا ارتکاب نہیں کر سکتا، اس لئے میں نے اپنے طور پر ایلکے کی عمر کا اندازہ لگایا تھا۔ گویا مجھے اخبار کے چار پانچ برسوں کی فائلوں کی ورق گردانی کرنی تھی، جس کے لئے اچھا خاصا وقت درکار تھا۔ اب چونکہ میرے اندر چھپا ہوا سراغ رسان جاگ اٹھا تھا، اس لئے میں نے یہ کام کر گذرنے کا دل میں ارادہ باندھ لیا اور فرصت نکال کر اخبارات کے آرکائیویز کے چکر لگانے لگا۔

لمبی چوڑی تلاش کے بعد آخر کار مجھے اخبار میں مقدمے کے بارے میں خبریں مل گئیں، جن میں میری توقع کے مطابق بہت ساری تفصیلات موجود تھیں۔ سرکاری ریکارڈ میں درج تھا کہ ایلکے کی ماں رینا ٹے کے ہاں توام بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں، جن کو دو برسوں تک مقامی ویل فیئر ادارے کے دفتر میں

متعلقہ کارکن کے سامنے پیش کیا جاتا رہا، جس کی رپورٹ کے مطابق دونوں بچیاں تندرست تھیں اور نارمل وزن رکھتی تھیں۔ تیسرے برس کہا گیا کہ ایک بچی کو اس کا باپ ماں کی مرضی کے خلاف اپنے ساتھ ملک سے باہر لے گیا تھا۔ اس سلسلے میں کوئی ثبوت نہ پیش کیا جا سکا، کیونکہ ماں نے بیٹی کے اغوا کئے جانے کی رپورٹ پولیس کے پاس درج نہیں کرائی تھی اور نہ ہی اس نے متعلقہ سرکاری محکمے کو اطلاع دی تھی کہ اس کا خاوند غیر قانونی طور پر ملک کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

سرکاری وکیل کے پوچھنے پر رینا ٹے نے بتایا کہ جب اس کو پتا چلا کہ اس کے خاوند نے ایک دوسری عورت کے ساتھ یاری لگا رکھی ہے اور دونوں چوری چھپے ملک سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہیں، تو اس نے غصے میں آ کر سرکاری محکمے کے پاس رپورٹ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھا سکتی، دونوں راتوں رات غائب ہو گئے تھے۔ دراصل یہ بات اس نے اپنے واقف کاروں سے اڑتی ہوئی سنی تھی۔ البتہ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ کس نے اسے بتائی تھی۔ اس وقت تک اسے علم نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ اس کی تو ام بیٹیوں میں سے ایک کو لے جائیں گے۔ پھر جب ایسا ہو گیا، تو وہ اس بات کی رپورٹ پولیس کے پاس کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، مگر یہ سوچ کر رک گئی کہ اس کا خاوند اپنی بیٹی کو ہی تو لے کر گیا تھا۔ گویا اس نے دونوں بچیوں کی ذمہ داری اس پر چھوڑ جانے کی بجائے ایک بیٹی کا بوجھ اٹھانے کا فیصلہ کر کے اس کی نظر میں کوئی جرم نہیں کیا تھا۔

سرکاری وکیل اس بات سے متفق نہیں تھا۔ اول تو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا کہ رینا ٹے کا خاوند کب اور کیسے ملک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دوسرے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ فی الواقع تو ام بیٹیوں میں سے ایک کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ یورپ میں مرد ایسا نہیں کیا کرتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بچوں کی دیکھ بھال ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ بچوں کے لئے اخراجات ادا کرنے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں، مگر خود بچوں کو پالنے کی ذمہ داری نہیں اٹھاتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ رینا ٹے نے دو بیٹیوں کو پالنے کے بوجھ سے گھبرا کر ایک بیٹی کو مار یا شاید بیچ ڈالا ہو۔

چونکہ عدالت کے سامنے اس بات کا ثبوت پیش نہ کیا جا سکا، اس لئے رینا ٹے کو بری کر دینا پڑا۔ مگر یہ مکمل اور باعزت بریت نہ تھی، کیونکہ وہ بھی اپنے حق میں شہادتیں پیش نہ کر سکی تھی۔ مقدمے کے مبصرین کے دلوں میں یہ شبہ بیٹھ گیا تھا کہ بیٹی کی گم شدگی میں ماں ملوث تھی۔ یہ بات کیسے مان لی جائے کہ بیٹی کے اغوا کے بعد ماں چپ رہے اور سرکار سے امداد طلب کرنے سے باز رہے۔ مگر اس وجہ سے

اس کو سزا بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔

ایلکے نے سیگی کو بتایا تھا کہ اس زمانے میں اس کی ماں کے والدین بقید حیات تھے اور اپنی بیٹی کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ انہوں نے ہی اسے کتابوں کی دوکان کھولنے کے لئے سرمایہ مہیا کیا تھا۔ ایلکے کا بچپن ان کے گھر پر گذرا تھا۔ اس کی ماں صبح دوکان پر جاتے ہوئے اسے ان کے حوالے کر جاتی تھی اور شام کو دیر سے لینے کے لئے آتی تھی۔ اس وقت تک اکثر بچی سو چکی ہوتی تھی اور اگلی صبح جب اس نے ابھی بمشکل آنکھیں کھولی ہوتی تھیں، ماں پھر اسے نانی نانے کے حوالے کر جاتی تھی۔ آگے چل کر وہی اسے سکول میں چھوڑنے کے لئے جاتے تھے اور چھٹی ہونے پر لینے کے لئے آتے تھے۔ ان کے گھر پر گذرے ہوئے ایام کی ایک ایک تفصیل اسے یاد تھی اور وہ اس بات پر بے حد فخر مند تھی کہ انہوں نے اس کی ماں کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور خود اسے کبھی ایک لحظے کے لئے بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ باپ کے بغیر پل رہی تھی۔

☆☆☆

میں ایک عرصے سے آؤٹ آف پرنٹ پیپر بیک ادبی کتابوں کی تلاش میں رہتا تھا، جن کے بکنے سے بچ جانے والے باقی ماندے ذخیرے کو عام طور سے پبلشر کوڑی کے داموں بیچ دیتے ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ کولون شہر میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک دوکان "پیپر بیک کتابوں کی جنت" پائی جاتی ہے، جہاں پر ہر وقت اتنا بڑا اسٹاک ایسی کتابوں کا موجود ہوتا ہے کہ اگر انسان پورا ہفتہ محض ان کے پشت پر لکھے ہوئے ناموں کو پڑھنا چاہے، تو اس کام سے نہ نپٹ سکے۔ میرا اس زمانے میں انسٹی ٹیوٹ کے کاموں کے سلسلے میں اکثر مغربی جرمنی کے صدر مقام بون جانا ہوتا تھا، جس کے لئے کولون میں گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ انسان آسانی کے ساتھ دو چار گھنٹوں کے لئے وہاں پر رک کر "پیپر بیک کتابوں کی جنت" کا چکر لگا سکتا تھا۔ میں نے اس بات کا ذکر ایلکے سے کیا اور کہا کہ ہمبرگ میں بھی ایک ایسی دوکان ہونی چاہیئے۔ یہ تجویز اسے پسند آئی اور اس نے کولون جانے کا پروگرام بنایا۔ وہ "پیپر بیک کتابوں کی جنت" سے ایجنسی لینا چاہتی تھی۔

جس روز ایلکے کولون جا رہی تھی، اتفاقی طور پر عین اسی روز میرا بون سے لوٹتے ہوئے وہاں پر

رکنے کا ارادہ تھا، جس کے دوران میں "پیپر بیک کتابوں کی جنت" کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں مقررہ وقت سے بہت پہلے پہنچ گیا تھا۔ ایلکے کے آنے میں ابھی چار گھنٹے پڑے تھے۔ دوکان کی تعریف کرنے والوں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ایک ہال نما کمرے میں کئی ہزار پیپر بیک کتابیں رکھی تھیں۔ میں تین ساڑھے تین گھنٹوں تک ان کو چھانٹنے میں لگا رہا اور جب اس کام سے فارغ ہو کر کتابوں کا اچھا خاصا بنڈل اٹھائے ہوئے بل کی ادائیگی کے لئے گیا، تو میری حیرانی کی انتہاء نہ رہی، کیونکہ دوکان کے کونٹر پر ایلکے بیٹھی ہوئی کتابوں کی قیمت وصول کر رہی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اس کی ہمبرگ سے آنے والی گاڑی کے پہنچنے میں ابھی آدھا پونا گھنٹہ پڑا تھا۔ میں نے آنکھوں کو رگڑا کہ کہیں نظر کے دھوکے کا شکار تو نہیں ہوں۔ پھر پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا، میری نظر اس کے نام کی تختی پر پڑی، جس پر "سلکے شروئیڈر" لکھا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایلکے کا خاندانی نام بھی "شروئیڈر" تھا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا یا میں جاگتے میں خواب دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی مماثلت اتنی غیر معمولی تھی کہ اگر "سلکے شروئیڈر" کے نام کی تختی نہ لگی ہوتی، تو میں پوچھ چکا ہوتا کہ کیا اس نے اپنی مقررہ گاڑی سے پہلے چلنے والی گاڑی لے لی تھی۔

میں نے پوچھا۔" کیا آپ ایلکے کی توام بہن ہیں؟"

اس نے جواباً سوال کیا۔" کیا آپ ایلکے کو جانتے ہیں؟"

میں نے کہا۔"میں اسے قریب قریب ہر روز دیکھتا ہوں۔ اس کی دوکان میری انسٹی ٹیوٹ کے بالمقابل ہے۔"

اس نے کہا۔" کیا آپ مجھے اس کا پتا دے سکتے ہیں؟ میں خاص طور پر اس سے ملنے کے لئے آسٹریلیا سے آئی ہوں۔ مگر اب تک مجھے اس کا اتا پتا لگانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔"

ہم ابھی یہی باتیں کر رہے تھے کہ میری نظر ایلکے پر پڑی، جو عین اسی لمحے دوکان میں داخل ہو رہی تھی۔ دونوں بہنوں نے حیرت سے نظر بھر کر دیکھا اور یہ پوچھنے سے بھی پہلے کہ کون کون تھی ایک دوسری کے کلا بے میں تھیں۔ دونوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو گر رہے تھے۔

سلکے کی دعوت پر ہم ایک قریبی کیفے ہاؤس میں جا کر بیٹھے۔ اس نے بتایا کہ ان کے باپ کو مرے ہوئے دس برس ہو چکے تھے۔ وہ کئی ایک راز اپنے ساتھ قبر میں لے گیا تھا۔ اس نے کبھی بھول کر بھی یہ ذکر نہ کیا تھا کہ جرمنی میں اس کی توام بہن ایلکے ماں کے پاس رہتی تھی۔ اس کے پاس ماں بیٹی کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ وہ یوں بھی اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بتانے کے سلسلے میں بہت بخیل تھا۔

ایلکے نے کہا کہ وہ باپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ ماں نے بھی اس سلسلے میں کنجوسی کا ثبوت دیا تھا۔ البتہ وہ اس بات پر خوش تھی کہ باپ جاتے ہوئے توام بیٹیوں میں سے ایک کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اس طرح ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار تھا، جس کے سبب ماں کا بوجھ آدھا رہ گیا تھا۔

سلکے نے کہا، "باپ کی دوسری بیوی سیلما نے، جس کی خاطر اس نے ماں کو چھوڑا تھا، بستر مرگ پر یہ راز کھولا تھا کہ سلکے کی جسمانی ماں دراصل رینا ٹے تھی، جس کے پاس اس کی توام بہن ایلکے رہتی تھی۔ سیلما کے پیٹ میں قدرتی طور پر سرے سے بچہ دانی نہیں تھی، جس کے سبب اس کو حمل نہیں ٹھیر سکتا تھا۔ چونکہ وہ ہر قیمت پر ایک بچہ چاہتی تھی، اس لئے اس نے باپ کے ساتھ مل کر یہ منصوبہ بنایا تھا کہ توام بہنوں میں سے ایک کو اپنے ساتھ لیتے جائیں اور اس کو اپنی بیٹی بنا کر پالیں پوسیں۔ رینا ٹے کا آدھا بوجھ اٹھانے کا خیال باپ کے دل میں شاید ہی آیا ہو۔"

(کمرفیلڈ۔ ۱۹ جولائی ۲۰۰۷ء)

مصنف کی دوسری اردو کتابیں

افسانوں کے مجموعے

۱۔زرد ستارہ۔لاہور۔۱۹۸۸ء۔ہمبرگ۔۱۹۹۱ء

۲۔شجر ممنوعہ۔لاہور۔۱۹۹۱ء

۳۔بنت حرام۔دہلی۔۱۹۹۹ء

۴۔بچھڑی ہوئی کونج۔دہلی۔۲۰۰۱ء۔لاہور۔۲۰۰۲ء

آپ بیتی

۵۔ڈھلتے سائے۔زندگی نامہ۔لاہور۔۲۰۰۶ء

مراسلات

۶۔حدیث یاراں۔مکتوبات۔دہلی۔۱۹۹۹ء

۷۔آغا بابر سے مراسلت۔زیر طبع

تراجم

۸۔معاصر جرمن ادب۔نمائندہ ادب پاروں کا مجموعہ۔ہمبرگ۔۱۹۸۶ء

۹۔آدمی جس نے اپنے آپ کو بھلا دیا۔جرمن کہانیاں۔لاہور۔۱۹۹۵ء

۱۰۔پیٹر بخسل۔کہانیاں،افسانے،خطبات بوطیقا۔لاہور۔۱۹۹۵ء

۱۱۔جیون سائے۔جرمن شاعرایریش فریڈ کی ایک سو نظمیں۔لاہور۔۱۹۹۲ء

۱۲۔میں اسے ڈھونڈتا پھرا۔دس جرمن شاعروں کی ایک سو نظمیں۔دہلی۔۱۹۹۹ء

۱۳۔دو دی دروازے۔جرمن شاعر وولفگانگ بیشلر کی ایک سو نظمیں۔دہلی۔۱۹۹۹ء